

APPROVED

By WWW.ATTABLIG.COM at 3:26 pm, Oct 19, 2010

وَمَا آتَيْنَاكَ إِلَّا حَقَّ الْمَقَالَةِ

النَّبِيُّ

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

أَشْرَفَ عَلَى الْبَرْقَةِ الْبَرْقَةِ الْبَرْقَةِ الْبَرْقَةِ الْبَرْقَةِ الْبَرْقَةِ الْبَرْقَةِ الْبَرْقَةِ الْبَرْقَةِ الْبَرْقَةِ

عَلَامَةُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

مَنْ كَتَبَ بِهَا مَكْتُوبًا

كُتِبَ لَهُ بِهِ أَجْرُ الْكَلْبِ

حکمت بانی کا چشمہ نور

يَعْلَمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ

ناظرین! آپ نے کتاب کا ایک ایک صفحہ پڑھ لیا، اسلام کی اخلاقی تعلیموں اور پیغمبر اسلام علیہ السلام کی اخلاقی ہدایتوں کا ایک ایک لفظ آپ کی نظر کے سامنے آگیا، آپ نے دیکھا کہ اسلام کا فلسفہ اخلاق کتنا مکمل اس کی تعلیم اتنی کامل اس کے تہذیب و تمدن کے اصول کتنے اعلیٰ اور اس کی اخلاقی تربیت کے نظریے کتنے بلند ہیں اور یہ سب کچھ ایک نبی اُمّی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبانِ فحیٰ تر جان سے ادا ہوا، اگر حضور علیہ السلام کی صداقت کی کوئی اور دلیل نہ بھی ہوتی تو یہی ایک چیز کافی تھی کہ جس بلند ہی تک حکمائے زمانہ، فلاسفہ و مفکران اور قوموں کے معلم پہنچنے سے عاجز رہے۔ معلم اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کسی انسانی تعلیم کے سہارے کے بغیر وہاں تک پہنچ گئے۔

اگرچہ یہ بات خود بھی اپنی جگہ پر بہت بڑی ہے، لیکن اس سے بھی بڑی یہ ہے کہ اس قوم کو جو تہذیب سے نا آشنا اخلاقِ عالیہ سے بیگانہ، اور سلیقہ و شعور سے عاری تھی، نہ صرف اخلاق و تمدن کے ایسے بلند حکیمانہ اصول اور نظریے سکھائے بلکہ اپنی تعلیم و تربیت کے صیقل سے ان میں ایسی جلا پیدا کر دی کہ دنیا کے اخلاقی جلووں کو دیکھ کر ششدر رہ گئی، اور حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ دعا قبول ہوئی یا یہ کہیے کہ وہ پیشین گوئی پوری ہوئی جو اسماعیلی نسل کے خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے لیے کی گئی تھی يَعْلَمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ یعنی ایسا نبی جو ان آیتوں کو اللہ کے احکام اور اخلاق و حکمت سکھائے اور ان کو اپنی تعلیم و تربیت سے پاک و صاف کر کے نکھار دے یہ نہ نکھارنے والا آیا اور نکھار کر دنیا کو پُر بہار بنا گیا اہل اللہ علیہ وسلم،

امید وار رحمت
سید سلیمان ندوی
۲۹ ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی کمال اور مستند مقبول عام سوانح حیات

سيرة النبي

جلد ہفتم

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ
علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

فہرست مضامین
سیرۃ النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم جلد ہفتم

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۷	اسلام میں حکومت کی حیثیت و اہمیت	۹	مقدمہ
			معاملات
			ساتویں جلد کا موضوع معاملات
			معاملات کے حدود
۳۸	عہد نبوی میں نظام حکومت	۱۰	معاملات سے ہماری مراد
			اس کام کا اشکال
۶۸	سلطنت اور دین کا تعلق	۱۱	دیگر مذاہب اور معاملات
			معاملات کے مآخذ
۷۷	سلطنت اور ملکیت کی حقیقت	۱۲	قانون سازوں کی بیچارگی
			جمہوریت کی ناکامی
			صحیح و عاقلانہ قانون سازی سے انسانیت کی نجات
			قانونِ الہی کی ضرورت
۷۸	لفظ ملک الملوک کی ممانعت	۱۳	کتاب اور میزان
			قانونِ الہی کی دائمی یکسانی
۸۷	امت مسلمہ کی بعثت	۱۴	فطری حقوق و معاملات کی یکسانی
			قانون کا بنیادی تخیل
۹۷	قوتِ عالمہ یا قوتِ آمرہ	۱۵	قانونِ الہی کی بنیاد اور اس کی عمومیت
۱۰۱	حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے		ایک اصولی فرق

APPROVED

By WWW.ATTABLIG.COM at 3:27 pm, Oct 19, 2010

نام کتاب — سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
مصنف — علامہ شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی
تاریخ طباعت — صفر المظفر ۱۴۰۸ھ
تعداد — ایک ہزار
پولیس — آر زیڈ پی کجڑ، لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين
وخاتم النبيين محمد وآله وصحبه اجمعين

سیرت النبی اب بین الاقوامی اسلامی کتب خانہ (جو صدیوں میں سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بلکہ اسلامیات پر مختلف اسلامی ملکوں اور دہلی بولی جانیوالی زبانوں میں تیار ہوا ہے) کی ایسی متاع گرانمایہ اور علمی شاہکار ہے جس کو کسی تعارف اور کسی مدح و توصیف کی اب ضرورت نہیں بلکہ اس کی انفرادیت کا اعتراف اور اس سے اپنے تاثر و عقیدت کا اظہار اپنی خوش مذاقی و دیدہ دری کا ثبوت فراہم کرنے کے مترادف ہے۔

مادح خورشید مداح خود است

حضرت الازاد مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ غیر معمولی وصف ہے کہ انہوں نے سیر کا دائرہ صاحب سیرت علیہ الف الف صلوٰۃ کی سیرت طیبہ، حالات و واقعات اور شمائل و عادات سے آگے بڑھا کر پیغام محمدی تعلیمات نبوی اور شریعت اسلامی کے تمام شعبوں تک وسیع کر دیا ہے انہوں نے پہلی دو جلدوں کے بعد جن کا اصل ڈھانچہ علامہ شبلی کے قلم اعجاز رقم کیا ہوا ہے، دلائل و معجزات اور منصب نبوت و عقائد، عبادات اور اخلاق کو بھی اپنی تصنیف کے دائرے میں لے لیا اور ان عنوانات پر چار ضخیم جلدیں مرتب فرما کر بعثت محمدی اور سیرت نبوی کی وسعت و جامعیت، اس کی بے خطر بہری و رہنمائی اور ہر عہد میں حیات انسانی و نسل آدم کے لیے ہدایت و سعادت کے اس سامان کو اس طرح علمی انداز میں پیش کیا اور دوسرے شاہکار تعلیمات سے تقابلی مطالعہ کا اہتمام کیا کہ یہ کتاب ہر ملک کی نئی تعلیم یافتہ نسل کے لیے رشد و ہدایت کا ایک صحیفہ و ذرات نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے گہرے تعلق کا ایک قوی ذریعہ بن گئی۔

سید صاحب کا ارادہ اخلاق کے بعد معاملات و سیاسیات پر بھی ایک ضخیم جلد مرتب کرنے کا تھا، اگر ایسا ہو جاتا تو یہ کتاب سیرت و تعلیمات نبوی پر ایک دائرۃ المعارف (انسانیکلو پیڈیا) کا درجہ حاصل کر لیتی ہے لیکن افسوس ہے کہ ان کو اس موضوع پر چند مضامین ہی کے لکھنے کی نوبت آئی تھی اور وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے تھے کہ انکی کتاب زندگی کا آخری ورق اُلٹ گیا اور وہ اس کتاب کو مکمل نہ کر سکے، لیکن انہوں نے جس پیمانہ پر اس کام کو اٹھایا تھا اور ان کے سامنے کتاب کا جو خاکہ اور منصوبہ تھا جس کا اندازہ اس کے مقدمہ ہی سے ہو جاتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اگر مکمل ہو جاتی تو نہ صرف سلسلہ سیرت النبی کی تکمیل ہو جاتی بلکہ ان کے علمی اور فہنی کمالات و وسعت نظر، جامعیت، اعتدال و توازن، احتیاط و تورع، شریعت اسلامی کی روح و مزاج سے آشنائی، قدیم و جدید کی واقفیت، دین کے اولین و مستند ترین ماخذ سے نہ صرف براہ راست واقفیت بلکہ ان میں اعلیٰ درجہ کی بصیرت

رکھنے اور اس علمی و فکری پختگی کی بنا پر (جو اس درجہ میں ان کے بہت کم معاصرین کو حاصل ہوگی) جو چیز تیار ہوتی اُس میں شریعت اسلامی اور تعلیمات نبوی کی بہتر سے بہتر نمائندگی اور ترجمانی ہوتی، انفرادی تفرید سے پاک تجدید و آزاد خیالی کے ہر شاہکار سے محفوظ اور اسی کے ساتھ جمود و تنگ نظری سے بھی پوری طرح بری ہوتی اور اس میں ان صد ہا سوالات کا جواب بھی ہوتا جو عصر حاضر کے ذہن اور حالات و مسائل کے مطابق کسی جامع کتاب کے نہ ہونے سے نشہ جواب رہتے ہیں، اس عہد کے خاص حالات نے اور مغرب میں جو فلسفہ وجود میں آئے اور اجتماعیات و سیاسیات کو جو اہمیت حاصل ہوئی (جس کی نظیر گذشتہ عہدوں میں نہیں ملتی) اس کے پیش نظر اس کی سخت ضرورت تھی اور یہ وقت کا ایک نہایت ضروری اور انقلاب انگیز کام ہو جاتا۔

لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو حیات مستعار کی تھوڑی فرصت رہ گئی تھی قلم میں خطبات مدارس اور سیرت النبی کی جلد سوم، چہارم، پنجم و ششم کا زور اور آتش علم کی روانی باقی نہیں رہی تھی پھر بعض اسباب کی بنا پر دارالمصنفین کی وہ پرسکون فضا اور اس کے وسیع کتب خانہ سے استفادہ کا بہتر وقت موقع اور فراغ خاطر باقی نہیں رہا تھا اور اس کتاب کا بڑا حصہ غالباً ناسازگار اور نامہوار حالات اور صحت کی غیر مستقل و غیر مستدل کیفیت میں لکھا گیا لیکن ایک مبصر و ماہر فن اور ایک استاد و کلمہ مشق مصنف کی بات ہی الگ ہوتی ہے، وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتا ہے اس میں ایک اتقان و شان پیدا کر لیتا ہے اور اس کے جہل میں سینکڑوں صفحات کا عطر اور اس کے اشارات میں بیسیوں کتابوں کا خلاصہ اور حاصل مطالعہ ہوتا ہے جس کی قدر و قیمت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے اس موضوع پر بیسیوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہو، اور وہ اس راہ کی مشکلات سے واقف ہوں۔

عرصہ سے سیرت النبی کے میخانے کے میخوار اور سید صاحب کی تحریرات و تحقیقات کے عاشق اس بات کے متمنی تھے کہ معاملات پر سید صاحب کے قلم سے سیرت جلد ہفتم کے لیے جو متفرق مضامین و مباحث نکلے ہیں اور سنا جاتا ہے کہ وہ ان کے پرانے کاغذات میں موجود ہیں، وہ اسی حالت میں کسی طرح زیور طبع سے آراستہ ہو جاتے تو ان کو پڑھ کر سیرۃ النبی کی چھ جلدوں کے قارئین و عشاق اپنی پیاس بجھاتے اور اپنے قلب نظر کو روشن کرتے، خدا کا شکر ہے کہ جناب سید صاحب الدین عبدالرحمن صاحب ناظم دارالمصنفین کو دوسری سعادتوں کے ساتھ اس وقت کے حصول کا بھی موقع ملا، اور انہوں نے ان مضامین کو یکجا کر کے سیرۃ النبی جلد ہفتم کے نام سے ایک مجموعہ میں جمع کر دیا، یہ حصہ اگرچہ سابقہ جلدوں کے مقابلہ میں ضخامت میں بہت کم ہے لیکن اس کی قامت کی کوتاہی کو اس کی قیمت کی بڑائی پورا کرتی ہے اور اس چھوٹی ہی کتاب میں بہت سے ایسے نکتے، وسیع مطالعے کا پھول اور فکری نظر کی پختگی کے نمونے موجود ہیں جو بہت سی ضخیم کتابوں میں نہیں ملیں گی، ان کے زمانے کے متعدد مصنفین اور تحریکوں کے قائد افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے ہیں اور انہوں نے مغربی و مادی فلسفوں کا اثر شعوری و غیر شعوری طریقے سے قبول کر لیا ہے، اس لیے ان کا قلم اس سلسلہ میں اور بھی زیادہ محتاط ہو گیا، اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو خود بھی اس موضوع کی نزاکت اور اس پر قلم اٹھانے کی ذمہ داری کا شدت سے احساس تھا، اس لیے ان کو اس میں عرصہ تک تردد رہا، مقدمہ میں فرماتے ہیں:

اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاق حال تسکین پاسکے، اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گزرنے پڑیں جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے، اور خصوصاً اس لیے کہ سیاسیات و اقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے علماء کی کتابیں نقصاً اکثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کر لیجانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے۔

آگے بڑھ کر لکھتے ہیں :-

اس جلد کے لکھنے میں اس بیچ ملان کو سالہا سال بچپن کا محسوس ہوتا رہی اور بار بار قلم کو آگے بڑھا کر ہٹا کر پچھتایا، چنانچہ کام کا آغاز، جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ کو کر دیا گیا تھا، لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیا، دو سال کے بعد ۲۹ رمضان ۱۳۵۷ھ کو پھر لکھنے کا ہمت کیا، اور پھر رگ جانا پڑا، ۲۴ شعبان ۱۳۵۷ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا لیکن چند ہی قدم چل کر رگ جانا پڑا اب یکم رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ کو دوبارہ عزم و رست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے مگر انجام عالم العیب کو معلوم ہے۔

اس مختصر کتاب میں بھی بعض ایسے اصولی مسائل آگے ہیں جن سے عام طبع پر اس موضوع کی کتابیں خالی ہیں اور اس اجمال کو تفصیل میں لیجانے سے بعض اوقات مستقل تصانیف وجود میں آسکتی ہیں مثلاً اس کتاب میں "معاملات" کی تعریف اس کے اقسام اور ان کی تاریخ خاصی بصیرت افروز اور معلومات افزا ہے میزان کی وسیع اور جامع تعریف قرآن کی آیات کے تتبع اور گہرے مطالعے پر مبنی ہے، سید صاحب کے قلم سے جو اس کتاب کی تالیف کے دوران سلوک کی ارتقائی منزلیں طے کر رہے تھے جن کا تقاضا عام حالات میں نہ صرف جسمانی گوشہ نشینی و انقطاع بلکہ ذہنی عزلت اور وحدت مطلب بھی ہوتا ہے، پھر ان کا جس مرکز ارشاد سے تعلق تھا وہ نہ صرف سیاست و حکومت کے مسائل سے کنارہ کش تھا بلکہ اس کو اصلاح و تربیت کے لیے بعض اوقات مضرب کھتا تھا ایسی صورت میں ان کے قلم سے حکومت کے نعمت ہونی کا نہ کہ نکلنا ان کے ذہنی توازن اور اپنی شخصیت کے فکری ممیزات کو قائم رکھنے کی دلیل ہے، وہ لکھتے ہیں :-

"اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت و سلطنت اور دنیا کی سیاست ہے، یہاں تک کہ کتاب و نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے۔"

پھر اس کے تحت میں قرآن کی آیات و بیانات جمع کر دیئے ہیں، اور یہ سیرت نبوی کے مصنف کا قدیم شیوہ ہے لیکن پھر ان کا عصری مطالعہ اور اسلامی تحریکات نے جو لٹریچر پیدا کیا ہے، اس کی واقفیت ان کا قلم پکڑ لیتا ہے اور ان کے قلم سے حسب ذیل الفاظ نکلتے ہیں اور اس طرح وہ راسخین فی العلم والدين کے مسلک کی پوری ترجمانی کرتے ہیں :-

"اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت اس دعوت

کا اصل مقصد تھا اور عقائد و ایمان، شرائع و احکام اور حقوق و فرائض اس کے لیے بمنزلہ تہذیب تھے، بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب ہیں، اور ایک حکومت کا محکمہ قیام ان کے لیے وجہ اطمینان اور سکون خاطر کا باعث ہے تاکہ وہ احکام اللہ کی تعمیل آسانی کر سکیں، اس لیے وہ عرضاً مطلوب ہے۔"

اور اس کی تائید کے لیے وہ سورہ نور کی وہ مشہور آیت نقل کرتے ہیں جس میں اللہ نے ان مسلمانوں سے جو ایمان اور عمل صالح سے متصف ہوں اور توحید اور جناب عن الشریک کی شرط پوری کرتے ہوں، خلافت کا وعدہ کیا ہے اور اس کی عرض اور نتیجہ دین مقبول کی پائیداری و استواری اور اس امن و امان کا قیام بیان کیا ہے جس کے بغیر دین کے احکام اور تقاضوں پر اطمینان سے عمل بھی نہیں ہو سکتا۔

مصنف کی نظر جو نیک مذاہب سابقہ پر بھی گہری اور وسیع ہے اور جدید فلسفے اور نظام بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں، عیسائیت کی تاریخ بھی ان کے سامنے ہے جو تفریق دین و سیاست کی قائل تھی اور اس کے متعلق ان کے نامور معاصر اور محبوب دوست اقبالؒ نے صحیح کہا ہے :-

کلیسا کی بنیاد برہانیت تھی ساقی کہاں اس فیکری میں میری

خصوصیت تھی سلطانی و راہی میں کروہ سر بلندی ہے یہ سر بزمیری

اس لیے خطبات مدارس اور رسول و حدیث کے مصنف کے قلم سے بے اختیار اور کسی قدر جوش کے ساتھ یہ عبارت نکل گئی ہے کہ

"اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی اور جنت سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لیکر اول ہی روز سے پیدا ہوا، اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر و نہیں، ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے، جس کے حدود حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ، اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے، وہی آسمان پر حکمران ہے وہی زمین پر فرمانروا ہے۔"

وہو الذی فی السما والہ و فی الارض والہ۔ اور وہی ہے جو آسمان میں اللہ اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے۔

چونکہ ان کی مسلمانوں کی تاریخ پر وسیع اور گہری نظر ہے اور انہوں نے دیکھا ہے کہ کس طرح خلافت اسلامی عام دنیاوی حکومت میں تبدیل ہو گئی ہے، نیز وہ موجودہ دور کے قیام حکومت کے نعرہ اور اس کے محرکات اور جذبات کو بھی سمجھتے ہیں، اس لیے یہ لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ :

اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول نہ خزانہ کا وصول ہے، نہ غنیمت کی فراوانی نہ دولت کی ارزانی، نہ تجارت کا فروغ، نہ جاہ و منصب کا فریب، نہ عیش و عشرت کا دھوکہ اور نہ شان و شوکت کا تماشہ ہے، بلکہ سرنامہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اس کے لیے جدوجہد اور سعی و محنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔

عرض یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود بہت سے فکر انگیز مضامین اور حقائق پر مشتمل ہے، اگر اس میں سیاست

اور نظم حکومت کا پورا حصہ آجاتا تو وہ اس عظیم خلا کو بہترین طریقے پر پُر کرتی جو جدید اسلامی لٹریچر میں پایا جاتا ہے اور جس کی اہمیت کا احساس موجودہ حالات میں مغربی فلسفوں کی سحر انگیزی اور اس کے تفوق و قیادت نے اور بڑھا دیا ہے، لیکن جو کچھ بھی ہے وہ اپنے اثر و وزن میں نقش سلیمانی ہے اور نقش ہمیشہ مختصر اور اکثر آنکھوں سے ستور ہوتا ہے۔

آثار قیامت میں سے یہ بات بھی ہے کہ سیرت نگار نبوی، مکمل اسلام اور نابغہ عصر، اساذالاسانذہ علامہ سید سلیمان ندوی کی شہرہ آفاق کتاب سیرۃ النبی کی کسی جلد پر یہ ہیچمان پیش لفظ لکھے، لیکن کسی قدر اس سے تسکین ہوتی ہے کہ کتاب مکمل نہیں ہے، اس لیے اس پر ایک ناقص کا کچھ لکھنا محل تعجب نہیں کہ ذکر دیتے ہیں بادۂ ظرف قدح خوار دیکھ کر

دارالمعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ۲۸ مئی ۱۹۸۰ء ابو الحسن علی ندوی رجب ۱۳۹۸ھ

اظہار عجز

من و شبہا و بیداری و حیرانی و خاموشی!

کہ محرم نیست خسر رازباں در گفت گوئے تو

ہیچمان مور سلیمان
سید صباح الدین عبدالرحمان

دارالمصنفین، اعظم گڑھ
۲۲ شعبان المعظم ۱۴۰۰ھ، جولائی ۱۹۸۰ء

لے اس مضمون میں مقدمہ کے حوالہ میں جو صفحات نمبر دیئے گئے ہیں وہ سابقہ ایڈیشن کے ہیں اس ایڈیشن میں نمبر صفحات تبدیل ہو گئے ہیں :

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالْقَلُوبِ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ وَعَلَى آلِهِ
وَأَصْحَابِهِ الطَّاهِرِينَ

مقدمہ

معاملات

ساتویں جلد کا موضوع معاملات | سیرت کی یہ ساتویں جلد معاملات سے متعلق ہے۔

معاملات کے حدود | معاملات کا اطلاق فقہانے حقوق عباد کے ایک خاص حصہ پر کیا ہے مثلاً بعض فقہاء شافعیہ نے احکام شرعیہ کی تقسیم یوں کی ہے، یا تو وہ آخرت سے متعلق ہوں گے تو ان کا نام عبادات ہے اور یا امور دنیا سے اس کا تعلق ہوگا تو ان کی تین قسمیں ہیں، اگر ان احکام شرعیہ سے جو امور دین کے متعلق ہیں، اشخاص کی بقاء مطلوب ہے تو ان کو معاملات کہتے ہیں، جیسے خرید و فروخت و اجارہ و رہن وغیرہ، اور اگر خاندان کی بقاء مطلوب ہے تو ان کا نام مناکحات ہے (جیسے نکاح و طلاق و خلع و تفریق وغیرہ) اگر ان کی غرض کسی پوری آبادی (مدینہ) کی بقاء ہے تو ان کو عقوبات کہیں گے، (جیسے قصاص و سزا و تعزیرات وغیرہ) امام شافعی نے موافقات کے شروع میں دین کے ضروری احکام کی جن پر دین و دنیا کی مصلحتیں موجود ہیں اور جن کے نہ ہونے سے دین و دنیا میں فساد راہ پائیگا اور انسانی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی، یہ قسمیں کی ہیں، عبادات جیسے نماز روزہ وغیرہ، اور عاوات جیسے ماکولات، مشروبات، طبوسات اور مسکونات کے احکام، اور تیسری چیز معاملات ہے جس سے مقصود نسل و نفس اور مال کی حفاظت ہے اور چوتھی چیز جنایات ہے جس سے مقصود وہ احکام ہیں جن کا اجرا اس شخص پر ہوگا جو احکام بالا کو توڑے، جیسے قصاص و حدود و تعزیرات

فقہائے احناف میں سے علامہ ابن نجیم ۲ نے بحر الرائق کے شروع میں امور دین کو پانچ حصوں میں مقسم کیا ہے، اعتقادات، عبادات، معاملات، منازعہ اور آداب اور ان میں سے معاملات کی تشریح یہ کی ہے کہ یہ حصہ پانچ بابوں پر منقسم ہے، معاوضات مالیہ (بیع و فروخت وغیرہ) مناکحات (نکاح و طلاق وغیرہ) منامات (آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ) امانات اور ترکات و وراثت، اور منازعہ، یعنی جن کاموں پر شریعت نے زجر کیا ہے اس کی بھی پانچ قسمیں ہیں، قتل نفس پر زجر، کسی کا مال زبردستی لے لینے پر زجر، کسی کی آبروریزی پر زجر، کسی کی پردہ دری پر زجر، قطع بیضہ (اسلام کا استیصال اور اس سے انحراف) پر زجر۔

لے کشاف، اصطلاحات الفنون احمد تھانوی، مطبوعہ مکتبۃ ج ۱ ص ۲۳ بحوالہ توضیح و تلویح :

معاملات سے ہماری مراد لیکن ہم نے اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تینوں تعبیروں سے زیادہ وسیع معنی میں کیا ہے، یعنی ہماری مراد معاملات سے وہ تمام احکام شرعیہ ہیں جن کا تعلق ان تمام حقوق عباد سے ہے جن کی حیثیت قانون کی ہے جن میں معاملات اور مزاجروں و لوگوں داخل ہیں اور جبکہ مشاجران و مال و آبرو کی حفاظت ہے، خواہ وہ اشخاص کی مصلحت سے متعلق ہوں یا خاندان کی، یا پوری آبادی و مملکت و مدینہ کی۔

آبادی و مملکت جن کا قانونی نام مدینہ ہے اس کی حفاظت و مصلحت کے قوانین کا نام سیاست ہے۔ لیکن ہمارے قدیم فقہانے اس کے لیے سیر کی اصطلاح قائم کی ہے، جیسے کتاب السیر امام محمد، اس میں آثار و خلافت اور صلح و جنگ کے مسائل آجاتے ہیں اور متاخرین نے ان کو احکام سلطانیہ کے نام سے لکھا ہے، جیسے احکام السلطانیہ قاضی ماوردی شافعی المتوفی ۳۵۰ھ اور احکام السلطانیہ قاضی ابویعلیٰ منبلی المتوفی ۳۵۵ھ، لیکن ان کتابوں میں مناجزیر و خراج و زکوٰۃ کی مناسبت سے مالی مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں، اور اسی لیے بعض بزرگوں نے ان مباحث کو الگ کر کے ان کا نام کتاب الاموال، یا کتاب الخراج رکھا ہے، جیسے کتاب الاموال ابو عبید بن سلام المتوفی ۲۳۳ھ اور کتاب الخراج قاضی ابویوسف المتوفی ۲۴۰ھ اور کتاب الخراج یحییٰ بن آدم القرطبی المتوفی ۳۸۰ھ، اہل سنت کے نزدیک گواہ امت اصول عقائد میں سے نہیں ہے تاہم اس کے ضروری مباحث کتب عقائد کے خاتمہ میں ذکر کر دیئے جاتے ہیں جن میں امامت کے شرائط اور طریق انتخاب، اس کی ضرورت اور حقیقت پر مختصر بحثیں ہوتی ہیں۔

لیکن موجودہ زمانے میں ان مسائل کی ترتیب اور ان کے بیان کا طرز الگ بزرگوں کے طرز بیان سے بالکل مختلف ہوگا اور ان کے نئے اصطلاحیں بھی نئی اختیار کرنی پڑیں گی اس لیے معاملات کی اس جلد میں قدیم اصطلاحات میں کمی بیشی اور مباحث میں رد و بدل اور نئی ضرورتوں کے لیے نئے ابواب کا اضافہ ناگزیر ہے۔

اب ہماری نئی اصطلاح میں معاملات سے مقصود مسلمانوں کے وہ تمام انسانی کاروبار ہیں جن کا تعلق معاشرت مال و دولت اور حکومت کے ضابطوں اور قوانین سے ہے دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیر یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تمام اجتماعی کاروبار کے ضابطوں اور قانونوں پر ہوا ہے جن سے دو یا دو سے ناڈ افراد یا پوری جماعت کے قانونی حقوق کی تشریح ہو اور ان کے ضابطوں اور قانونوں کی تفصیل ہو ان تمام مسائل کو اگر ہم کسی قدر مساحت کے ساتھ چند بڑے بڑے عنوانوں کے تحت کرنا چاہیں تو حسب ذیل تین قسمیں ہو سکتی ہیں، معاشریات، اقتصادیات اور سیاسیات اور ان تینوں کے تحت میں اور بہت سے ضمنی ابواب ہو سکتے ہیں، اور انہی تینوں مباحث کے مجموعہ پر معاملات کا اطلاق کیا گیا ہے، معاشریات میں نکاح و طلاق وغیرہ کے قوانین سے بحث ہوگی، اقتصادیات میں تمام مالی و تجارتی کاروبار کا بیان آجائے گا اور سیاسیات میں حکومت و سلطنت اور اس کے متعلقات مذکور ہوں گے۔

اس کام کا ایشکال یہ احکام قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں مذکور ہیں، محدثین نے حدیث کی کتابوں میں ان حدیثوں کو مختلف ابواب میں ذکر فرمایا ہے جن میں یہ احکام مذکور ہیں اور فقہاء نے فقہ کے متعدد بابوں میں ان مسائل کا احاطہ کیا ہے اس لیے ان احکام کو اگر صرف نقل ہی کر دینا ہوتا تو کام آسان تھا مگر موجودہ زمانے

میں کام کی نوعیت اتنی ہی نہیں ہے بلکہ اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاق، حال تسکین پاکے اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے آئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے، ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود کلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گزرنا ہوگا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے اور خصوصاً اس لیے کہ سیاسیات و اقتصادیات کے موجودہ توقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے قدماء کی کتابیں نقصاً اکثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو راستی سے ملے کر لیجانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے، مشکلات کا ایک اور سبب یہ ہے کہ عہد نبوی کے سیاسیات کے احکام و فرائض کا ماخذ خود ذات نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں امامت کے ساتھ نبوت بھی جمع ہے جس سے ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناخن کو گوشت سے علیحدہ کرنا ہے یہی سبب ہے کہ اس جلد کے لکھنے میں اس وسیع مدد کو سالہا سال ہیکچا ہٹ محسوس ہوتی رہی اور بار بار قدم کو لگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹنا پڑا، چنانچہ کام کا آغاز گوئے، جمادی الثانیہ ۱۳۵۵ھ کو کر دیا گیا تھا لیکن کچھ صنفی لکھکر چھوڑ دیئے، دو سال کے بعد ۲۹ رمضان ۱۳۶۰ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کر لیا اور پھر رگ جانا پڑا، ۲۴ شعبان ۱۳۶۲ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا۔ لیکن چند ہی قدم چل کر رگ جانا پڑا۔ اب یکم رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ کو دوبارہ عزم درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے مگر انجام عالم الغیب کو معلوم۔ رب اشوٰح لی صدیری و یسری لی افسری و اخلل عقیقۃ من لسانی یفعلوا قوٰلی۔

دیگر مذاہب اور معاملات دنیا کے مذاہب نے معاملات کو اپنی تعلیم کا حصہ بنانے میں مختلف رجحانات ظاہر کیے ہیں، تورات میں وہ مذہبی قوانین کا ضروری اور اہم جزو ہے لیکن عیسائیت نے ان کو نظر انداز کر دیا، ہندوستانی مذاہبوں میں بھی دونوں قسمیں نظر آتی ہیں، عام ہندوؤں میں منو شاستر اور اس کی مختلف تشریحات انہی معاملات کی شائیں ہیں، مگر شاید بودھ مت نے اخلاق ہی کو بڑھا کر قانون بنانے کی کوشش کی ہے تاہم یہ سب قومیں اپنے قانون کا ماخذ علم الہی اور علم مافوق انسانی کو قرار دیتی ہیں۔

معاملات کے ماخذ دنیا میں ایسی قومیں بھی ہیں جنہوں نے اپنے قانون کی بنیاد وحی الہی کے بجائے عقل انسانی پر رکھی ہے اور انسانی تجربہ و قیاس کو اپنے قانون کی اساس بنایا ہے اور کہیں صرف سردار یا بادشاہ کی شخصی خواہش اور میلان طبع قانون کا معیار ہے کہیں شخص نے جمہوریت کی شکل اختیار کر لی ہے اور افراد کی کثرت اور کثرت اور کسی طرح رائے دینے والوں کی تعداد کی کمی اور بیشی کو صحت اور غلطی، صواب اور خطا اور حق و باطل کا معیار بنایا گیا ہے یہ افراد و ارکان مختلف اداروں سے چنے جاتے ہیں اور مختلف فرقوں سے منتخب ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر انفرادی ہو یا ہوس نہ ہو تو بھی فرقہ وارانہ ہوا ہو اس اور جماعتی تعصب اور فرقوں کا نفع و نقصان قوانین جمہور کی بنیاد قرار پاتا ہے اور جمہوریت کے لباس میں شخصیت اور فرقہ واریت صرف اپنے نفع کی خاطر جمہوریت پر حکم نافذ کرتی ہے۔ اور جمہور کو اس کا پابند بناتی ہے۔

قانون سازوں کی بیچارگی اگر اسلام کے قانون میں مسلم اور غیر مسلم کا ایک فرقہ بیچ میں حاصل ہے تو

جمہوری نظام میں ملکی اور غیر ملکی قوم اور غیر قوم، امیر اور غریب، سرمایہ دار اور مزدور، تجارت پیشہ اور زمیندار طبقہ اور غیر طبقہ، پارٹی اور غیر پارٹی کے بیسیوں ججایات اور دیواریں حائل ہیں جن میں سے ہر ایک اس قدر مضبوط ہے کہ اس کا ہٹانا آسان نہیں، جب کوئی تجویز معروض بحث میں آتی ہے تو انسانیت کے نقطہ نظر سے نہیں بلکہ ملک، قوم، جماعت، طبقہ اور پارٹی کے نقطہ نگاہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور اس کو جمہور کے لیے آئیہ رحمت ثابت کیا جاتا ہے۔

جمہوریت کی ناکامی | اس جوش و خروش اور قوت اور دلیل سے جو تجویز آئیہ رحمت بن کر منظور ہوتی ہے اس کی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ ہر دوسری مجلس میں وہ بیک دفعہ یا چند منزلوں کے بعد بدل جاتی ہے پھر ایک نئی تجویز اس کی جگہ پر آتی ہے اس کی عمر بھی چند روز سے زیادہ وفا نہیں کرتی، آخر وہ بھی فنا ہو جاتی ہے اور تیسری اور چوتھی اور پانچویں آتی ہے اور اپنی اپنی راہ سے فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے، ان تمام تغیرات کی تہیں جو ہمتہ کام کرتا ہے وہ قومی و جماعتی اور شخصی مفاد کا اول بدل اور تغیر ہے، ایک راہ سے جب کسی جماعت کو فائدہ نہیں پہنچتا ہے یا ایک کو پہنچتا ہے دوسرے کو نہیں، تو وہ دوسری راہ سے اس کو ڈھونڈتی ہے اور جب وہ راہ بھی بند پاتی ہے تو تیسری راہ کی تلاش ہوتی ہے اور یوں ہی پوری عمر آوارہ گردی اور تلاش میں گزر جاتی ہے اور جمہور کی کوٹھالی کی دولت ہمتہ نہیں آتی۔

صحیح و عادلانہ قانون سازی | ان تغیرات کے باوجود جو قانون بنتا ہے، چونکہ وہ صرف ظاہری طاقت پر سے انسانیت کی ناچاری یعنی ہوتلے اس لیے اس کے چلانے میں اس کے چلانے والوں کا دل شریک نہیں ہوتا، اس لیے قدم قدم اس کے چلانے والوں کے ذاتی مفاد سے ٹکراتا ہے اور بار بار وہ حرص و طمع، غرور، تکبر، ہوا و ہوس، رشوت اور انتفاع ناچاٹو خوف و ہراس اور مکر و جیل کے بیسیوں خلاف انسانیت جذبات سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتا ہے اور عدل و انصاف کی میزان ہمتہ سے ٹوٹ جاتی ہے۔

قانون الہی کی ضرورت | اسی سبب سے مصلحت الہی کا تقاضا یہ تھا کہ عدل و انصاف کی یہ میزان خود دست الہی میں ہو، وہ جو کسی فرقہ اور کسی پارٹی میں نہیں، کسی کا ایسا نہیں جو دوسرے کا نہیں، وہ سب کا ہے اور سب کے لیے ہے اور تمام انسانی اغراض سے پاک و بے نیاز ہے جس کو اپنے لیے اور اپنی عرض کے لیے کچھ نہیں چاہیے جس کو دنیا اور اس کی فطرت کا ایک ایک اذ معلوم ہے اور جو کائنات کے ذرہ ذرہ سے آگاہ اور گوشہ گوشہ سے باخبر ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح دنیا میں عرش سے فرش تک نے اپنا تکوینی فرمان جبکو قانون طبعی کہتے ہیں، جاری کر رکھا ہے اسی طرح زمین پر اپنا تشریفی فرمان جس کو شریعت کہتے ہیں جا کر فرلے جو تمام تر عدل و انصاف پر مبنی ہے۔

اللہ الذی انزل الکتاب بالحق والمیزان (سورہ: ۲) وہ اللہ جس نے حق اور ترازو کیساتھ اپنی کتاب (قانون) اتاری، **وانزل معہم الکتاب والمیزان** (حدید: ۲۳) اور انبیوں کے ساتھ کتاب (قانون) اور ترازو اتاری۔ **کتاب اور میزان** | میزان سے مقصود یہ کاٹھ اور لوہے کی ترازو نہیں، بلکہ فطرت اور عدل و انصاف اور

حق کی میزان ہے جس سے سارا نظام کائنات ٹل رہا ہے، اور سارے انسانی کاروبار اور اعمال تولے جاتے ہیں چنانچہ تمام معاملات میں انصاف کا خلاصہ گرا ایک لفظ میں کیا جائے تو یہ ہے کہ عدل کی میزان کیا اونچ نیچ نہ آئے۔ **الرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَ الْبَيَانَ خَلَقَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ مِيزَانًا وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ وَالسَّمَاءُ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ وَاَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ** (درجن: ۱)

یہ دنیا کی سب سے بڑی ترازو ہے اسی سے دنیا میں اعمال اور معاملات تولی جاتے ہیں، اسی کے اعتدال اور اونچ نیچ کا نام حق اور باطل، انصاف اور ظلم، صبح اور غلط ہے اس لیے اس پیمانہ اور ترازو کو ہمیشہ سچائی اور انصاف کے کانٹے پر رکھو۔ ان آیتوں میں انسان کا آفتاب، ماہتاب اور نباتات سے پہلے تکرار ہے کہ یہ قصد ارادہ سے محروم مخلوقات اللہ تعالیٰ کے تکوینی فرمان کے تحت طبعی طور سے قصد ارادہ کے بغیر کس طرح عدل و انصاف اور اللہ تعالیٰ کے مقررہ طبعی احکام و اصول کے مطابق چل رہی ہیں، اسی طرح قصد ارادہ کی دولت و نعمت سے سرفراز مخلوق انسان کو بھی چاہیے کہ وہ ہوائے نفسانی سے بچ کر اپنے قصد ارادہ سے اللہ تعالیٰ کے احکام عدل کی پیروی اختیار کرے، قرآن پاک میں بار بار ہے۔

وَاذْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ (انعام: ۱۶) اور ناپ تول کو پورا کرتے رہو۔
فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ (اعراف: ۹) تو ناپ اور تول کو پورا رکھو۔
اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ (ہود: ۹) ناپ اور تول کو پورا رکھو۔
وَلَا تَنْفُسُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ (ہود: ۹) ناپ اور تول کو گھٹاؤ نہیں۔

ان آیتوں میں ناپ اور تول سے معمولی لین دین اور خرید و فروخت کی اشیاء بھی مراد لیا جاسکتی ہیں اور لی گئی ہیں، لیکن اس پیمانے کو وسیع کیجئے تو سارے انسانی معاملات اس ترازو اور پیمانہ میں سما جاتے ہیں، ہر انسانی ظلم کا تخم یہ ہے کہ انسان اپنے لیے ایک پیمانہ اور دوسرے کے لیے دوسرا پیمانہ چاہتا ہے، وہ اپنے لیے ایک ترازو سے ناپتا ہے اور دوسروں کے لیے دوسری ترازو سے اس ستم پیشہ پر خدا کی اور ساری دنیا کی پھٹکار۔

وَقِيلَ لِلْمُظْطَفِّينَ الَّذِينَ اِذَا اُكْتُلُوا عَلٰی النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ وَاِذَا اُكُلُوْهُمُ اَوْ ذُرُوْهُمُ يُخْسِرُوْنَ (تطہیف: ۱) پھٹکار ہے ان کم کر دینے والوں پر جو اپنے لیے لوگوں سے ناپ پوری لیتے ہیں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم کر دیتے ہیں۔

معاملات انسانی میں فساد کی پوری فہرست اسی ایک اجمال کی تفصیل اور اسی نکتہ کی تشریح ہے، چنانچہ سورہ حدید میں زمین میں قیام عدل کے تین ذریعے ظاہر فرمائے گئے ہیں۔

۱۔ تفسیر طبری میں آیات میزان سورہ حدید اور سورہ رحمان وغیرہ میں دیکھئے

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا
مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ
بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ
شَدِيدٌ وَمَنْفَعٌ لِّنَّاسٍ (حدید: ۲۰)

اور ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں کیساتھ بھیجا اور ان
پیغمبروں کیساتھ کتاب اتاری اور عدل کی ترازو دینا کہ
لوگ انصاف پر قائم رہیں، اور ہم نے لوہا اتارا جس میں سخت
ہیبت ہے اور لوگوں کے لیے کئی فائدے ہیں۔

اس آیت پاک میں عدل کے قیام اور ظلم کی روک تھام کے لیے تین چیزیں ارشاد فرمائی گئی ہیں، ایک
کتاب، یعنی احکام الہی کا مجموعہ، دوسری چیز وہ فطری صحیح و عادلانہ میزان جو ہر صداقت شعار دل میں دھری
ہے اور جس پر انسانی قانون کی بنیاد کھڑی ہے، اور تیسری چیز تلوار کی طاقت ہے جو ان دنوں کے ملنے پرانگی
گروہیں جھکا دیتی ہے، یعنی جو احکام الہی کے ماننے سے منکر ہیں اور جو اپنی فطرت کی صحیح میزان عدل کو توڑ چکے ہیں
ان کو پھر طاقت کے زور سے قانون کے ملنے پر مجبور کیا جاتا ہے، یہ آہنی آلہ جس کے ایک ہاتھ میں ہوتا ہے اس کا نام
حکومت و ریاست ہے اور اس کے دوسرے ہاتھ میں قانون الہی کی کتاب بھی ہونی چاہیے جس کے ماننے پر
وہ اپنے ماتحتوں کو مجبور کرے۔

قانون الہی کی دائمی یکسانی | قانون الہی کے نظریہ پر ایک شبہ یہ پیش ہوتا ہے کہ دنیا میں حالات ہمیشہ
بدلتے رہتے ہیں اس لیے انسانی معاشرت کے خاکے بھی بدلتے رہتے ہیں اور بدلتے رہیں گے اس لیے قانون کو بھی
بدلتا رہنا چاہیے، مگر یہ خیال سراسر فریب ہے، کیونکہ شے نہیں بدلتی، اس کے رنگ، شکل اور پہلو بدلتے رہتے ہیں۔
جس طرح مادیات کے اصول طبعی کبھی نہیں بدلتے (إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ)، گرم چیز ہمیشہ گرم رہتی ہے اور
ٹھنڈی ٹھنڈی آگ برف نہیں بنتی، برف آگ نہیں، روشنی تاریکی نہیں، تاریکی روشنی نہیں، زمانہ ہمیشہ
بدلتا ہے، رات اور دن پہلے درپے آتے اور جاتے رہتے ہیں، گھنٹے گھڑی، پلک اور لمحے دم بدم بدل رہے ہیں
سال پر سال آتے ہیں مگر چاند اور سورج وہی ہیں، ان کی چال اور گردش وہی ہے اور ان کے قاعدے اور قانون وہی
ہیں، جو طبعی قانون آج سے ہزار برس پہلے آب و گل کی دنیا پر حکمران تھا، آج بھی وہی ہے اس میں نہ پہلی صدی
تغیر پیدا کر سکی، نہ چودھویں صدی، پہلے بھی سال کے بارہ مہینے یا قمری دورے تھے اور اب بھی ہیں، کل بھی دن رات
کے چوبیس گھنٹے اعداد اب بھی ہیں۔

یعنی خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی۔

وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلنَّاسِ عَلَى النَّاسِ مِلًّا فَمَنْ كَانَ عَلَى مِلٍّ خَالٍ فَلَيْسَ عَلَيْهِ مِلٌّ وَلَا يَمْلِكُ عَلَيْهِمْ شَيْئًا مِّنْهُ لِيَتَّقِيَ اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ ۚ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (۲۱)

فطری حقوق و معاملات کی یکسانی | ٹھیک اسی اصول پر جو اخلاقی و معاشرتی قوانین اور انسانی معاملات
کے جو اصول فطری ہیں ان میں نہ کبھی کوئی تغیر ہوا ہے نہ ہوگا، نیکی بدی نہیں بنتی، بدی نیکی نہیں
ہو جاتا، جھوٹ سچ نہیں، ظلم انصاف کا نام نہیں پاتا اور انصاف ظلم کا نہیں، دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا،
دوسروں کی چیز ناحق لینا، چوری کرنا، ڈاکو ڈالنا، دوسروں کی عزت و آبرو کو داغ لگانا، دوسروں کے مال کو ناجائز طریق سے
لے لینا، حق قانون کے بغیر کسی عورت پر تصرف کرنا، کسی کی جائیداد اور ملکیت پر قبضہ کرنا ہمیشہ ناجائز رہا ہے اور

رہے گا، لین دین میں طرفین کی رضا مندی، لڑائی اور جھگڑے کے اسباب کی روک تھام، اخلاق سوز حرکات
کی بندش، فتنہ و فساد کا انسداد، ظالمانہ طریقوں کی ممانعت نہر عہد میں، ہر قانون کی متفقہ دفعہ رہی ہے جب
کبھی کوئی قانون بنا ہے یہی فطری دفعات قانون کے ضروری اجزاء رہے ہیں اور اب بھی جب کبھی بنے گا اس
کے یہ اجزاء برقرار رہیں گے، البتہ اس کے جزئیات نئے نئے پیش آئیں گے اور نئی نئی شکلوں میں ان کلیات
کے فروع سامنے آتے رہیں گے اور ان کے لیے قانون الہی کے کلیات سے جزئیات اور احکام سے نظام ہمیشہ
نکلے اور بنتے رہیں گے۔

قانون کا بنیادی تخیل | ہر مجموعہ قانون کا ایک بنیادی تخیل ہوتا ہے جس پر اس مجموعہ کے ایک ایک جز کی
بنیاد ہوتی ہے، یہ بنیاد کیسے قومی فوقیت، کہیں وطنی افادیت، کہیں نسلی امتیاز اور کہیں تجارتی مفاد قرار پاتی ہے
اس لیے اس مجموعہ قانون میں اسی بنیادی نقطہ غرض کی لکیریں ابھری نظر آتی ہیں جہاں قانون کی بنیاد قومی
فوقیت ہے، وہاں کالے گورے، یورپین اور نیٹو کے اصول پر کار فرمائی ہے جہاں وطن قانون کی اساس ہے
وہاں جغرافیائی اقطاع ارضی قانون کے اختلافات کا باعث ہوتے ہیں اور رومی اور غیر رومی، یونانی اور غیر یونانی، مصری
اور غیر مصری، ملکی اور غیر ملکی نزاعات نے انسانی مفاد کے ٹکڑے کر دیئے ہیں یہی جذبہ آگے بڑھ کر ملک میں
بھی صوبہ دار اختلاف کا بیج بوتا ہے، ہندوستانی ہونے کے باوجود پنجابی بنگال میں اور بنگالی پنجاب میں بیگانہ
ہے، بہاری یوپی میں جگہ نہیں پاسکتا اور یوپی والے پر بہار کی وسعت تنگ ہے، فیض پور اور نازی ازم میں
نسل کے دیوتا کی پوجا ہوتی ہے اور موجودہ امپیریلزم میں تجارتی مفاد کی خاطر قومیں غلام بنائی جاتی ہیں۔

قانون الہی کی بنیاد اور اس کی عمومیت | اسلام کے قانون کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اطاعت
کے لیے زمین سے فتنہ و فساد کا دفع، اس کے بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن و اطمینان کا قیام
اور معاملات میں لوگوں کے درمیان سے نزاع اور خدع و فریب کی روک تھام ہے، چنانچہ اسلام کے قانون
میں جتنے حدود و تعزیرات ہیں ان کا مقصد زمین سے فتنہ و فساد کا دفع ہے اور جس قدر معاملات و معاشرت
کے اصول اور مسائل ہیں، ان کا مبنی بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن و اطمینان کا قیام ہے، اور
معاملات میں جتنے قانونی ممنوعات اور منہیات ہیں، ان سب کا مقصد باہمی نزاع اور خدع و فریب کا استیصال ہے۔
اس اوپر کی تفصیل میں آپ نے دیکھا کہ کیسے رنگ اور نسل کا کوئی اختلاف، زبان اور لغت اور تہذیب و تمدن
کا کوئی فرق اور ملک و اقلیم کا کوئی امتیاز زیر بحث نہیں آیا ہے، یہ قانون خدا کا ہے، خدا کے سارے بندوں کے
لیے بنایا گیا ہے، وہ چاہے کالے ہوں یا گورے، آریائی ہوں یا سامی، یورپی ہوں یا ایشیائی، ہندی ہوں یا عجمی،
عجمی ہوں یا تاتاری، سب کے لیے یکساں اور سب کے لیے برابر ہیں۔

ایک اصولی فرق | بے شبہ ایک فرق اس میں جائز رکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حکومت ان کی ہوگی جو اس کے
لے علامہ عبداللہ بن عبد السلام مصری المتوفی ۷۰۳ھ کی کتاب قواعد الاحکام فی مصالح الانام، اور شاہ ولی اللہ
صاحب دہلوی کی کتاب حجتہ اللہ بالافعال کے ابواب معاملات ملاحظہ ہوں ۛ

اس قانون کو قانون الہی تسلیم کرتے ہیں، اس بنا پر انسانی افراد کی چار قسمیں ہو جاتی ہیں ایک وہ جو اس قانون کو قانون الہی تسلیم کرتے ہیں، یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خدائے واحد و برحق کی طرف سے آخری طور پر آیا ہوا قانون مانتے ہیں، مسلمان ہیں دوسرے وہ جو اس خاص قانون الہی کو نہیں مانتے لیکن وہ کسی نہ کسی اگلے قانون الہی کو خواہ وہ کیسے ہی غیر محفوظ صورت میں اس وقت ہو، مانتے ہیں، ان کا نام ذمی ہے، لیکن ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کے پاس مانا ہوا قانون الہی اب بھی ان کے ماننے ہوئے صحیفہ الہی کے ضمن میں موجود ہے، یہ کتابی ہیں اور دوم وہ جو اپنے قانون الہی کے صحیفہ کو کھو بیٹھے ہیں، یہ شبر کتابی ہیں جو حقیقی وہ ہیں جو سرے سے ہر صحیفہ الہی سے نا آشنا اور ہر قانون الہی سے محروم ہیں ان کو مشرک کہتے ہیں، اسلامی قانون الہی میں ان چاروں کے درمیان بے شبہ بعض امتیازات ہیں، جن کی تفصیل اہل علم و فضل اپنی جگہ پر آئیں گی۔

اس تفصیل کے بعد آپ کو اجازت یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ معاملات کے حدود کیا ہیں اور اس کی وسعت میں کیا کیا چیزیں داخل ہیں، تاہم اس اجمال کا ایک ہلکا سا خاکہ آپ کے سامنے ہم بھی کھینچ دیتے ہیں۔
ہم انسانوں کے درمیان خوشگوار تعلقات کے برقرار اور امور معاشرت کی میزان کو درست رکھنے کے لیے ایک عامانہ طاقت و قوت کا وجود ضروری ہے، جو ہر چیز کو احکام شرع اور نظام عدل کے مطابق قائم رکھے، اس بحث کے دو ضروری جز ہیں۔

۱۔ اس عامانہ طاقت و قوت کی ضرورت، حقیقت، اس کے شرائط و اوصاف اور اس کے شعبے اور ادارے۔

۲۔ معاملات انسانی کے اقسام اور ہر قسم کے علیحدہ علیحدہ احکام، اور اس کے سر اور مصالح۔

÷

اسلام میں حکومت کی حیثیت و اہمیت

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لے کر آئے، آپ نے صرف آسمانی بادشاہی کی خوشخبری نہیں سنائی، بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی، تاکہ دنیا میں خدا کی بندگی اور رضا جوئی بے خوف و خطر کی جاسکے اور اس کے لیے خدا کی بادشاہی خدا کے قانون کے مطابق دنیا میں قائم ہو۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا (نور: ۵۵)
خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے، یہ وعدہ کیا کہ وہ انکو زمین میں حاکم بنائے گا، جیسا کہ انکو حاکم بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے اور ان کیلئے ان کے اس دین کو جسکو اسے انکو واسطے پسند کیا ہے، بجا دے گا اور انکو انکی اس بے امنی کے بدلے امن دے گا، میری بندگی کریں گے، میرا کسی کو ساجھی نہ بنائیں گے۔

اور اس کے لیے خدا کے نافرمانوں سے لڑائی لڑی جائے تاکہ سارا حکم اسی ایک خدا کا ہو جائے۔
وَتَأْتَلُوهُم حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِئْتَهُ وَتَكُونَ
الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (انفال: ۵۵)
اور ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فساد نہ رہے، اور سب حکم اللہ کا ہو جائے۔

قرآن نے خدا کے بعض نیک بندوں کی دعا یہ بتائی ہے :-
رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (بقرہ: ۲۰۵)
اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا بھلائی دے، اور آخرت میں بھلائی دے، اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔

آخرت کی بھلائی تو معلوم ہے، لیکن دنیا کی بھلائی ہمارے مفروضے نے یہ بتائی ہے، علم و عبادت، تندرستی، روزی، مال و دولت، فتح و نصرت، اولاد صالح، مگر یہ بھی حق تعالیٰ کے اطلاق کی تجدید ہے۔ دنیا کی بھلائی وہ ہے جو خدا کی شریعت میں جائز ہے، ایک اور جگہ فرمایا :-

لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ مِّمَّا كَانُوا كَاغِبًا (محل: ۳)
اور جنہوں نے نیک کام کیے ان کے لیے دنیا میں بھلائی ہے اور آخرت کا گھر سب سے اچھلے اور پرہیزگاروں کا گھر کیا اچھلے۔

مقصود یہ ہے کہ انکو کاروں کے لیے دنیا کی بھلائی اور عزت بھی ہے، اور آخرت کی بھی، لیکن آخرت کی بھلائی دنیا کی بھلائی سے زیادہ بہتر اور زیادہ خوب ہے۔

جن لوگوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی ان کو بشارت ہے،
فَاتَّخِذُوا لِلَّهِ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحَسُنَ ثَوَابُ
تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب

الْآخِرَةِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (آل عمران: ۱۵۰) عنایت کیا اور اللہ نیکی والوں کو چاہتا ہے۔

دنیا کا ثواب فتح و نصرت، ناموری و عزت، مال و دولت اور حکومت و سلطنت ہے، جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف اٹھائی، خدا نے ان کو دونوں جہان کی نعمتیں بخشیں۔

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظَلَمُوا لَنَبُوْنَهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَآ جَزَاءُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ (دخان: ۶۱) اور جنہوں نے گھر چھوڑا خدا کے لیے ستائے جانے کے بعد ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانہ دیں گے، اور بے شک آخرت کی مزدوری سب سے بڑی ہے۔

دنیا کا اچھا ٹھکانہ دنیا کی ہر جائز نعمت اور سطوت و حکومت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دین اور دنیا دونوں کی نعمتوں کی دعا مانگی۔

وَاسْتَبْرَأْ لَنَا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ (اعراف: ۱۹۱) اور (اے خدا) ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی لکھ اور آخرت میں بھی۔

ان سب آیتوں میں یہ بات خیال کے قابل ہے کہ ایمان اور نیکی والوں کو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی امید دلائی گئی ہے، مگر ہر جگہ یہ بتا دیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر بھلائی سے آخرت کی بھلائی اونچی، اچھی اور پائیدار ہے اس لیے دنیا کی بھلائی ہماری زندگی کا اصل مقصد نہیں، بلکہ فتنی ہو، یعنی آخرت کے کاموں کے صدقہ میں ہو ورنہ اگر دنیا ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تو دنیا تو مل جائے گی مگر آخرت ہاتھ نہ آئے گی۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا لَوْ تَوَلَّوْا إِلَيْهِمْ أَعْمَالُهُمْ وَهُمْ فِيهَا كَالْبُخْسُونَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلاَّ النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَلَغَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (ہود: ۲۱) جو کوئی دنیاوی زندگی اور اس کی آرائش چاہے تو ہم ان کے عمل ان کو اسی دنیا میں بھر کر دیتے ہیں، اور کمی نہیں کی جاتی یہ وہ ہیں جن کے لیے آخرت بھی دوزخ کے سوا کچھ نہیں، اور وہاں جو کیا تھا مٹ گیا اور ان کی کمائی اکارت ہوئی۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ (شوری: ۲۳) جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے تو ہم اس کی کھیتی بڑھاتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے تو ہم دنیا میں سے اس کو کچھ دیتے ہیں اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔

مَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشَّاعِرِينَ (آل عمران: ۱۵۱) ہم اس کو دیں گے اور جو آخرت کا ثواب چاہے گا اس میں سے ہم اس کو دیں گے اور جو دنیا کا ثواب چاہے گا اس کو دیں گے اور جو کوئی چاہتا ہو دنیا نے عاجل کو تو ہم جلد سے دیتے

مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مِنْ مَّوْمِنٍ أَمْ دَحْوَ تُرَابٍ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُوَ الَّذِي كَانَ سَيِّئُهُمْ مُّشْكُوًّا رَّبِّي (اسرائیل: ۲۰) ہم جو چاہتے ہیں جہنم جہنم بنالیا ہے وہ اس میں داخل ہوگا بڑا ہو کمرہ دھکیلا جا کر، اور جو کوشش کرتا ہے اور وہ ایمان والا ہو تو یہی ہیں جن کی کوششوں کی قدر کی جائے گی۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَيُعْطِهُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (نساء: ۱۹) تو جو کوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو اس کو معلوم ہو کہ اللہ کے پاس دنیا و آخرت دونوں کا ثواب ہے۔

پھر وہ کتنا احسن ہے جو صرف دنیا کے ثواب کا طالب ہے، حالانکہ خدا کے پاس تو دونوں جہان کے خزانے ہیں۔

مفروض یہ ہے کہ جو تنہا دنیا کا طالب ہے وہ آخرت سے محروم ہے لیکن جو آخرت کا طلبگار ہے اس کے لیے دونوں گھروں کے دروازے کھلے ہیں، لیکن جو اپنی حماقت اور نادانی سے صرف دنیا کے ثواب کا طالب بنے گا تو دنیا تو اس کو مل جائے گی مگر آخرت کے ثواب کا دروازہ اس کے لیے بند ہو جائے گا۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت اور سلطنت اور دنیا کی سیاست ہے یہاں تک کہ کتاب اور نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے۔

فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا (نساء: ۸) تو ہم نے ابراہیم والوں کو کتاب اور حکمت دی، اور بڑی سلطنت بخشی۔

حضرت موسیٰ اپنی قوم سے کہتے ہیں:-

لَقَوْمٌ إِذْ كُفُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلْنَا فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا (مائدہ: ۳۰) اے میرے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو۔ جب تم میں نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا۔

حضرت موسیٰ کی یہ پیشین گوئی جو خبر کی صورت میں ہے، حضرت طالوت بادشاہ اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں پوری ہوئی، طالوت کی نسبت خبر دی گئی۔

إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا (بقرہ: ۲۴۶) بے شبہ خدا نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا۔ لوگ اس پر مقرر ہوئے تو فرمایا:-

وَاللَّهُ يُبَوِّئُ لِمُلْكِهِ مَنْ يَشَاءُ (بقرہ: ۲۴۶) اور اللہ جس کو چاہے اپنی حکومت دیدے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو خطاب ہوا:-

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ (ص: ۲۰) اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس نعمت میں مزید وسعت کی دعا فرمائی:-

رَبِّ اعْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي

اے میرے پروردگار! میری مغفرت کر اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا فرما کہ میرے بعد کسی کو شایان نہ ہو۔

(۳۱)

یہ نعمت کسی انسان کے دینے لینے سے نہیں ملتی، اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے وہ جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے چھین لے۔

اللَّهُمَّ مَلِكُ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ

اے اللہ! اے سلطنت کے مالک! تو جسے چاہے سلطنت بخشے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔

وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ (آل عمران: ۳۱)

وہ دیتا کس کو اور چھینتا کس سے ہے؟ اس کے متعلق اپنا قاعدہ کلیہ بنا دیتا ہے :-

إِنَّ الْأَرْضَ يَورِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ

بے شک زمین کے مالک میرے صالح بندے ہوتے ہیں۔ اس اعلان میں خدا کے سرمانبردار

إِنَّ فِي هَذَا آيَةً لِّقَوْمٍ

لوگوں کے لیے پیام ہے۔

عَبِيدِينَ (الانبیاء: ۷۷)

نعمت ملنے کی بشارت ملی تھی تو ساتھ ہی یہ بتا دیا گیا کہ یہ نعمت ان کے کن کاموں کا معاوضہ ہے سرمایا :-

وَلْيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنْصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ

اور البتہ خدا اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرتا ہے، بے شک اللہ زبردست قوت والا ہے وہ کہ اگر

لِقَوِيَّ عَزِيزُهُ الَّذِي إِن تَمَكَّنْهُمْ

ہم ان کو زمین میں جہاد میں تو وہ نماز کھڑی کریں، زکوٰۃ دیں، اچھے کاموں کو کھیں اور برے کاموں سے

فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ

روکیں اور ہر کام کا انجام خدا کے اختیار میں ہے۔

وَأَصْرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (رج: ۶۱)

اور ظاہر ہے کہ جو اچھے کاموں کو کئے گا اور برے کاموں سے روکے گا، وہ پہلے خود اچھا ہوگا، اور برے کاموں سے باز رہتا ہوگا۔

خدا کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے دین حق کی مدد کی جائے، جو لوگ حق کی مدد کے لیے اٹھتے ہیں، خدا ان کی مدد فرماتا ہے، ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں خدا کے

قانون کے اجراء کی طاقت ہونی چاہیے، چنانچہ اسلام میں سارے حدود و تعزیرات اسی منشاء کے مطابق ہیں۔

زنا کی حد میں فرمایا :-

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

اور نرم گمان دونوں دنیاویوں، پر اللہ کی حد جاری کرنے میں کوئی ترس نہ آوے، اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو۔

وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (نور: ۱۱)

سود کے اسلامی قانون کو جو نہ مانے اے اللہ اور رسول سے لڑائی کے لیے تیار ہونا چاہیے۔

فَأَذْنُوبُ حَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ

تو اے سود کھانے والو! اللہ اور اس کے رسول

وَرَسُولِهِ (بقرہ: ۳۸)

سے لڑنے کے لیے خبردار ہو جاؤ۔

اس لیے نجران کے عیسائیوں سے آپ نے صلح کا جو معاہدہ کیا تھا، اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر وہ سودی لین دین کریں گے تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا۔ جو لوگ اسلام کے ملک میں بغاوت کریں، ڈاکہ ڈالیں لوٹ مار کریں، قرآن اس کو خدا اور رسول سے لڑنا کہتا ہے اور اس کی سزا قتل، پھانسی، قطعید اور قیدیاجلاوت ہے، اور ان کی اس بے بسی کی کیفیت کو عذاب اور دنیاوی رسوائی کہا ہے :-

ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي

یہ ان کے لیے رسوائی ہے دنیا میں اور آخرت میں

الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (مائدہ: ۵۵)

بڑا عذاب ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد جب فرعون نے اپنی شہنشاہی کے غرور میں بنی اسرائیل پر مظالم کے پہاڑ توڑنے شروع کیے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تسلی دی۔

اِسْتَجِیْنُوْا بِاَمْرِ اللَّهِ وَاَصْبِرُوْا اِنَّ الدُّرُحٰی

خدا سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو۔ زمین تو خدا کی

يَلْقٰی یُّوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِیْ

ہے (اور) وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ (اعراف: ۵۵)

مالک بنا دیتا ہے اور آخر بھلا تو ڈرنے والوں کا ہے۔

بنی اسرائیل نے اس صبر و تسلی پر جو درحقیقت پیشین گوئی کی بشارت تھی، انہیں اضطراب ظاہر کیا تو پھر فرمایا :-

عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَذُوْكُمْ

قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک

وَلَیْسَتْ خَلْفُكُمْ فِی الْاَرْضِ فِیَنْظُرْ کَیْفَ

کرے، اور اس کی جگہ تمہیں زمین میں خلیفہ بنائے

تَعْمَلُوْنَ (اعراف: ۱۵)

پھر دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو۔

آخر جب وعدہ الہی کے پورا ہونے کا وقت آیا تو فرعون کی شہنشاہی کا تخت الٹ گیا اور مصر کی بچی غلام اور بے کس قوم خلافت الہی کے تاج سے سرفراز ہوئی :-

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ کَانُوْا یُسْتَضَفُّوْنَ

اور ہم نے اس قوم کو جو کمزور سمجھی جاتی تھی اس

مَشَارِقِ الْأَرْضِ وَمَغَارِبِهَا الَّتِیْ بُرُكْنَا

زمین کے پورے پیکم کا وارث بنا دیا جس میں ہم نے

فِیْهَا وَتَمَّتْ کَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی

برکت دی ہے اور اللہ کی اچھی بات بنی اسرائیل کے

بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا (اعراف: ۱۶)

حق میں پوری ہوئی ان کے صبر کی وجہ سے۔

یہ نعمت ان کو حق کی راہ میں صبر و استقلال سے ہاتھ آئی اور دنیا کی برکت اور سرفرازی ان کو ملتی رہی لیکن جب ان کے ہاتھ سے راہ حق میں صبر و استقلال کا دامن چھوٹنے لگا اور پیغمبروں کے ماننے

سے منہ پھرنے لگے تو دفعۃً عزت کا یہ تاج ان کے سر سے اتر گیا، اللہ نے پیشین گوئی فرمائی :-

وَقَضٰی اِلٰی بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ فِی الْكِتَابِ لَنَقْصِدَنَّ

اور ہم نے بنی اسرائیل کو خبردار کر دیا تھا کہ تم کو

فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا جَبِيْرًا
ثَلَاثَ أَجَاءٍ وَعُذُّوا وَلَهُمَا بَعْعُنَا عَنْكُمْ
عِبَادَ الْأَنْبِيَاءِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ فَجَاءُ سُوْرًا
خِلَالِ الدِّيَارِ يَدْعَاكَ وَعُذُّوا مَقْعُودًا ثُمَّ
رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُمْ
بِأَمْوَالٍ نَّجِيْبَةٍ وَجَعَلْنَاهُمْ أَكْثَرُ نَفِيْرًا إِنْ
أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِنْ
أَسَأْتُمْ فَلَهَا فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ
لِلنَّاسِ أَجُوزْهُكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ
كَمَا دَخَلُوْهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيَبُذُّوا مَا
عُلُوْا فِيْهِ (مِثْنِ اسْرَائِيل ۱۱)

زمین میں فساد کرو گے اور بڑی سرکشی کرو گے
تو جب ان میں سے پہلے وعدہ کا وقت آیا تو ہم نے
ان پر اپنے بڑے سخت بندوں کو بھیجا، تو وہ ملک میں
گھس گئے اور اللہ کا وعدہ ہو کر رہتا ہے پھر ہم نے
ان پر تم کو بھیجا، اور تم کو مال اور اولاد سے مدد کی، اور
تمہاری تعداد بڑھائی اور کہہ دیا کہ اگر تم نیک کرو گے
تو اپنے لیے اور بڑا کر دے گا تو اپنا، پھر جب دوسرے
وعدہ کا وقت آیا تو اوروں کو تم پر ابھارا تاکہ تمہارا
مذہب بگاڑیں اور بیت المقدس میں ویسے ہی گھس جائیں
جیسے (تمہارے پہلے دشمن) پہلی دفعہ اسمیں گھس گئے تھے
اور جس چیز پر غلبہ پائیں اسے تباہ کر دیں۔

اہل خبر کو معلوم ہے کہ قرآن پاک میں بنی اسرائیل کے واقعات جہاں اور دوسرے اعراض سے بیان
کیے گئے ہیں وہاں ایک غرض یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے لیے وہ عبرت کا سبق بنیں اور انہیں معلوم ہو کہ
اگر وہ بھی خدا کے عہد کو پورا نہ کریں گے تو ان کے ساتھ بھی خدا کا وہی برتاؤ ہوگا۔

اور یہ کہ آیتوں میں تصریح ہے کہ جب بنی اسرائیل کو خلافت ملی تو انہیں پہلے ہی ہتیار کر دیا گیا
تھا کہ یہ خلافت و سلطنت اسی وقت تک ہے جب تک احکام الہی کی پیروی کی جائے۔ جب تم ان کے
مذہب پھرو گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی تم سے منہ پھیر لے گی، چنانچہ اسلام سے پہلے یہودیوں کی تاریخ میں یہ
دونوں موقعے پیش آئے، اور دو دفعہ ان کی شامت اعمال سے بیت المقدس کو پامال اور ان کو ذلیل و محکوم
ہونا پڑا۔ ایک بابل کے بادشاہ بولکنذر معروف بہ بخت نصر کے ہاتھوں، اور دوسری دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ
السلام کے انکار کے بعد رومیوں کے ہاتھوں سے۔

ان آیتوں سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ مذہبی سلطنت کا مٹ جانا، ظالم بادشاہ کے پنجوں میں گرفتار ہونا
اور دوسروں کی محکومی جو خود ہمارے ہی بُرے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے، دنیا میں اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب
کا سبب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے موقع پر ان کو آخری مہلت دی گئی چنانچہ اوپر کی آیتوں کے
بعد ہی ارشاد ہوا۔

عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يَرْحَمَكُمْ وَإِنْ عُذْتُمْ
عُنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيْرًا
إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّذِي هُوَ أَشْوَرُ

امید ہے کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم کرے گا، اور اگر تم
پھر وہی (حرکتیں) کرو گے، تو ہم بھی وہی (پہلا سلوک)
کریں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنا

وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ
الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيْرًا

(بنی اسرائیل ۱۰)

رکھا ہے، یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا
ہے، اور مومنوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں بشارت
دیتا ہے کہ ان کے لیے اجر عظیم ہے۔

یہ رحمت کی اُمید اسی شرط سے مشروط تھی کہ وہ آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، لیکن وہ جب
اس سے محروم رہے تو رحمت الہی بھی دور ہو گئی، کیونکہ انہیں سنا دیا گیا:

أَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ (بقرہ ۵۰)

تم میرا وعدہ پورا کرو تو میں تمہارا وعدہ پورا کروں گا۔
بقرہ رکوع ۱۰ میں اسی پیشانی الہی کی بار بار یاد دلائی گئی ہے۔

وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآئِيلَ لَا
تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا
وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَآكِينِ وَقُولُوا
لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ
ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَأَنْتُمْ
مُعْرِضُونَ (وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا
تَسْفِكُونَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تَخْرُجُونَ
أَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَ
أَنْتُمْ تَشْهَدُونَ ثُمَّ أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ
تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتَخْرُجُونَ فَرِيقًا
مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظْهَرُونَ عَلَيْهِمْ
بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَإِنْ يَتْلُوْكُمْ
أُسْرَىٰ تُفْجَدُوا هُمْ وَهُمْ مُحَرَّرُونَ
عَلَيْكُمْ أَخْرَأْهُمْ أَفَلَا تُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ
الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ (بقرہ ۱۰۰)

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ خدا کے سوا کسی
کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور
یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ جھلائی کرتے رہنا، اور
لوگوں سے اچھی باتیں کہنا اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے
رہنا، تو چند شخصوں کے سوا تم سب

(اس عہد سے) منہ پھیر بیٹھے اور جب ہم نے تم سے عہد لیا
کہ آپس میں کشت و خون نہ کرنا اور اپنے کو ان کے
وطن سے نہ نکالنا، تو تم نے اقرار کر لیا اور تمہارا اس
بات کے گواہ ہو، پھر تم وہی ہو کہ اپنوں کو قتل بھی
کر دیتے ہو۔ اور اپنے میں سے بعض لوگوں پر گناہ
اور ظلم سے چڑھائی کر کے انہیں وطن سے نکال بھی
دیتے ہو اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو بد لہ دیکر
انکو چھڑا بھی لیتے ہو، حالانکہ انکا نکال دینا ہی تم کو حرام تھا
(یہ کیا بات) ہے کہ تم کتاب (خدا) کے بعض احکام کو مانتے
ہو اور بعض سے انکار کیے دیتے ہو۔

لیکن ان کے اس عہد کو ہمیشہ کے لیے جلا دینے پر اللہ تعالیٰ نے بھی انکو ہمیشہ کے لیے جلا دیا اور فرمایا:-

فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا جِزَآءُ
فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ
إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ (بقرہ ۱۰۰)

تو جو تم میں سے ایسی حرکت کریں ان کی سزا اس کے
سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں تو رسوائی ہو اور
قیامت دن سخت سے سخت عذاب میں ڈال دیئے جائیں۔

مسجدوں کی ویرانی اور خصوصاً بیت المقدس کی ظاہری و باطنی تباہی کے جرم پر اہل کتاب کو سزا سنائی گئی،
اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو خدا کی مسجدوں میں

ان آیتوں میں لف و نشر مرتب ہے، یعنی ان میں سلطنت کے ملنے کو عزت اور سلطنت کے چھین جانے کو ذلت فرمایا گیا ہے۔

لیکن یہاں ہمارے سمجھنے کے قابل یہ بات ہے کہ یہود پر یہ جو کچھ ہو رہا ہے اور ہوگا اس کا تعلق یہود کی نسل و قومیت سے نہیں، بلکہ ان کے افعال و کردار سے ہے، احکام الہی سے انحراف، انبیاء و مسلمین امت کا قتل و تکذیب، حرص و طمع، سود خواری اور تمام دیگر ذمائم و قبائح جن کی تفصیلات مذکور ہیں، وہ اس کے نتیجہ میں کردہ زمین کی وراثت اور خدا کی خلافت کے رتبہ سے ہمیشہ کیلئے محروم کر دیئے گئے، پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الصُّلَحَاءَ أَوْلِيَاءَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ وَالْعُلَاقَةُ لَأُولَئِكَ فِي الْحَبْلِ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ حُرُوفًا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَ بَنِي إِسْرَافِيلَ ۚ

خدا نے فرمایا، جن لوگوں نے، پھر طے کو (معبود) بنا لیا، ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا، اور دنیا کی زندگی میں ذلت و نصیب ہوگی، ہم افترا پر درازان کو ایسا ہی بدلہ دے کر دیتے ہیں۔

یہ ذلت کا دنیاوی عذاب صرف گائے کے بچہ کے بچاریوں ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر اس مفری کے لیے ہے جو توحید کا حامل ہو کر غیر کے آستانے کی جہہ سائی کرے گا اور ارض و سما کے مالک کو چھوڑ کر دنیا کے دوسرے چھوٹے مالکوں کی تلاش و طلب میں در بدر پھرے گا، مگر عزت کا سرمایہ اس کو ہاتھ نہ لے گا۔

وَمَنْ يَتَّبِعْ أَهْوَاءَ بَنِي إِسْرَافِيلَ ۚ

اور جس کو اس کے اعمال کے پاداش میں، خدا رسوا کرے اس کو عزت دینے والا کوئی نہیں۔

عزیز سے کہ از در گمش سر بتافت
بہر در کہ شد بیج عزت نیافت

اللہ تعالیٰ کی موعودہ نعمت کے حصول کا ذریعہ صرف اس کی بندگی ہے، اس کی یہ بندگی اس کے احکام کو بے دل و جان قبول کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے ظاہر ہوتی ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ ہے اور اسی کی رضا آخرت میں جنت اور دنیا میں طمانیت و برکت کی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو بے دل و جان قبول اور زبان سے اس کے اعتراف کا نام شرع میں ایمان، اور ان کے مطابق کام کرنے کا نام عمل صالح ہے اور یہی دین اور دنیا کی ہر قسم کی برکتوں کے خزانہ کی کنجی ہے اور اسی طاقت سے آسمان اور زمین سے برکت کا مینہ برستا اور فتوحات کا چشمہ ابھرتا ہے۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوا وَاتَّقَوْا
لَكُفِّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَا دُخْلُكُمْ
جَنَّةَ النَّعِيمِ وَلَا لَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ
اتَّقَوْا وَالَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هُمْ

اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو ہم ان سے ان کے گناہ محو کر دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے اور اگر وہ تورات و انجیل کو درجہ جو دار کتابیں، ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل

مَنْ رَبِّهِمْ لَأَكْفُرُوا قُلُوبَهُمْ وَمِنْ
نَبِيٍّ أَرْجَلُهُمْ (مائده: ۹۰)

ہوئیں ان کو قائم رکھتے تو ان پر ذوق مین کی طرح ہوتا کہ اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔

لیکن افسوس کہ انہوں نے اس آواز پر کان نہیں رکھا، تو ان کو وہی سزا دی گئی جو دوسری نافرمان قوموں کو دی گئی تھی،

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا
لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابَاتِ السَّمَاءِ
وَالَّذِينَ كَذَبُوا فَاتَّخَذُوا لَهُمْ
بَمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (اعراف: ۱۲)

اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور پرہیزگار ہو جاتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات دے کے دروازے کھول دیتے، مگر انہوں نے تو تکذیب کی سو ان کے اعمال کی سزا میں ہم نے ان کو پکڑ لیا۔

پھر خاص مسلمانوں سے بطور وعدہ کے فرمایا گیا۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ (نور: ۴)

جو لوگ ان میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دیگا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔

ایک اور جگہ فرمایا۔

وَعَدَ اللَّهُ مَنَّا مَنَّا كَثِيرَةً قَاتِلُوا فِيهَا
فَعَجَّلَ لَكُمْ هَذِهِ (فتح: ۲۱)

خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان لوگوں کو قتل کرو گے، سو اس نے غنیمت کی تمہارے لیے جلدی فرمائی۔

مجاہدین امت کو بشارت ملی کہ دنیا اور عقبی دونوں کی بادشاہی تمہارے ہی لیے ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى
تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابِ أَلِيمٍ ۚ تَوْمِنُونَ
بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ
لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۚ يَغْفِرُ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ
وَيُدْخِلُكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
الْأَنْهَارُ وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتٍ عَدْنٍ
ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۚ وَأَخْرَجُوا مِنْهَا
نُصْرًا مِّنَ اللَّهِ وَفَتْحًا قَرِيبًا وَبَشِيرًا
مُّؤْمِنِينَ (الصف: ۲۱)

مومنو! میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذاب الیم سے مخلصی دے وہ یہ کہ، خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور خدا کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کرو، اگر تم سمجھو تو یہ تمہارا حق میں بہتر ہے، وہ تمہارا گناہ بخش دے گا اور تم کو باغ عداں جنت میں جن میں نہریں بہہ رہی ہیں اور پاکیزہ مکانات ہیں جو بہشتیئے جاودانی میں (تیار ہیں) داخل کرے گا، یہ بڑی کامیابی ہے اور ایک چیز جس کو تم بہت چاہتے (یعنی تمہیں خدا کی طرف سے مدد نصیب ہوگی اور فتح عنقریب ہوگی اور مومنوں کو اس کی خوشخبری سنا دو۔

یہ فتح و نصرت اسی دنیا میں ملنے والی تھی، جس کا مقدمہ ام القریٰ مکہ معظمہ کی فتح تھی، اور اس کی انتہا ساری دنیا میں اسلام کی سر بلندی اور دین الہی کی ہر دین پر فوقیت اور غلبہ۔

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى
وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ
كُلِّهِمْ (توبہ: ۵)

وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین
حق دے کر بھیجا، تاکہ اس دین کو دنیا کے تمام
دینوں پر غالب کرے۔

یہ پیشین گوئی دو دفعہ سورہ فتح و سورہ صف میں دہرائی گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ توبہ اور فتح
والی پیشین گوئی کفار کے اور سورہ صف والی اہل کتاب کے مقابلہ میں ہے یہ پیشین گوئی ایکے لنگ میں
پوری ہو چکی اور ابھی اس کو دوسرے لنگ میں آئندہ پوری ہونا ہے اور یہ مسلمانوں کی مجموعی اور اطمینان کا
باعث ہے لیکن اس کے پورے ہونے کے لیے مسلمانوں پر سعی و کوشش بھی فرض ہے، بدر و غیرہ غزوات میں
فتح کی پیشین گوئی کو منجر صادق علیہ السلام کی طرف سے دی جا چکی تھی، تاہم مسلمانوں کو اس کے لیے بھی
وہی ہی کوشش کرنی پڑی جیسا کہ سورہ فتح کی پیشین گوئی میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے :-

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ
وَلَا يَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلْكَافِرِينَ (انفال: ۵)

سارا حکم خدا کے لیے ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری کے سوا دنیا میں کئی حانی
و جہانی قوت کی اطاعت اور حکم برداری نہ رہے، جس کی بھی اطاعت ہو، وہ خدا کی اطاعت کے ضمن اور
تحت میں اس کی اجازت اور اس کی رضا سے ہو کہ وہ بھی خدا ہی کی اطاعت ہے۔

قرآن پاک میں جگہ جگہ مسلمانوں کو فتح و نصرت اور حصول غنیمت کی بشارت دی گئی ہے جس کے
صاف معنی یہ ہیں کہ وہ شہروں پر قبضہ اور ملکوں پر بادشاہی کریں گے، دولت کے خزانے ان کے
ہاتھ آئیں گے :-

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ
يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي
قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ
وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً
يَأْخُذُونَ وَنَهَاكَ أَنْ اللَّهُ عَزِيزٌ
حَكِيمٌ وَعَدَكُمْ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَ
فَعَجَلْ لَكُمْ هَذِهِ... وَأُخْرَى لَمْ
تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ
بِهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيرًا (فتح: ۲۱)

(اے پیغمبر!) جب مومن تم سے رخت کے نیچے بیعت
کر رہے تھے تو خدا نے خوش ہوا، اور جو صدقہ قلوب
انکے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا تو ان پر
تسلی نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح و غنیمت کی بہت
سی غنیمتیں جو انہوں نے حاصل کیں، اور خدا غالب
حکمت والا ہے، خدا تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا
کہ تم ان کو حاصل کرو گے، تو اس نے غنیمت کی
تمہارے لیے جلدی فرمائی..... اور غنیمتیں بھی جن
پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے، اور وہ خدا ہی کی قدرت
میں تھیں، اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ فتح و غنیمت جس کے بجملت پانے کی خبر اس آیت میں ہے وہ خبر کی فتح ہے، جو بیعت رضوان کے

فوراً ہی بعد حاصل ہوئی، اور دوسری فتح اس کے بعد حاصل ہونے کی طرف اشارہ ہے، وہ مکہ کی فتح ہے
چنانچہ اسی سفر میں حدیبیہ سے واپسی میں یہ خوشخبری مسلمانوں کو سامعہ نواز ہوئی :-

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا (فتح: ۱۰)
اے محمد! ہم نے تم کو فتح دی، فتح بھی صریح اور صاف
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں نبوت کے فرائض انجام دے چکے اور خانہ کعبہ کے ساتھ سارا
عرب بھی بت پرستی کی بنیاد سے پاک ہو چکا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس فتح و نصرت کے وعدے کے
پورے ہونے کے بعد عالم آخرت کی طرف متوجہ ہونے کی طرف آمادہ فرمایا :-

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ
يُذْخِلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَنْفُسَهُمْ أَجْبَاءً
يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ
الَّذِينَ يَقُولُونَ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ
إِنَّا نَجِدُكَ كَذِبًا أَوَّلَ مَا
جَاءَنَا بِالدِّينِ وَكَانَ
الَّذِينَ يَدْعُونَكَ إِلَى الدِّينِ
أَوَّلَ مَا جَاءَكَ بِهِمْ
يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ مِنَ
الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَقُولُونَ
يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا
نَجِدُكَ كَذِبًا أَوَّلَ مَا
جَاءَنَا بِالدِّينِ وَكَانَ
الَّذِينَ يَدْعُونَكَ إِلَى الدِّينِ
أَوَّلَ مَا جَاءَكَ بِهِمْ
يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ مِنَ
الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَقُولُونَ
يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا
نَجِدُكَ كَذِبًا أَوَّلَ مَا
جَاءَنَا بِالدِّينِ وَكَانَ
الَّذِينَ يَدْعُونَكَ إِلَى الدِّينِ
أَوَّلَ مَا جَاءَكَ بِهِمْ

اسلام کی دعوت شرک کی تردید اور توحید کی تعلیم سے شروع ہوئی اور اس کے بعد شرائع اور احکام
آہستہ آہستہ بڑھتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی، طاعات اور عبادات کی دعوت، فرائض و حقوق
کی ادائی، قلوب نفوس کی صفائی اور اخلاق کی برتری اور برگزیدگی کی تعلیم و تربیت تدریج کے ساتھ
تکمیل کو پہنچتی گئی، ساتھ ہی ساتھ سلطنت کا نظام خود بخود بنتا گیا اور وہ بھی تکمیل کو پہنچ گئی، اس موقع پر
ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔

اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت
اس دعوت کا اصل مقصد تھا، اور عقائد و ایمان، شرائع و احکام اور حقوق و فرائض اس کیلئے بمنزلہ
تمہید تھے، بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب ہیں، اور ایک
حکومت صالحہ کا قیام ان کے لیے وجہ اطمینان اور سکون خاطر کا باعث ہے، تاکہ وہ احکام الہی کی تعمیل
بآسانی کر سکیں، اسلئے وہ عرضاً مطلوب ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی نکتہ کا ترجمان ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ
مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي
رِضُوا لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ
بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي
وَلَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا (نور: ۷)

جو لوگ تم سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے
میں سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دینگا جیسا
ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جو
انہیں پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار کر دینگا اور خوف
کے بعد ان کو امن بخشنے گا، وہ میری عبادت کریں گے
اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے۔

اس آیت میں خلافت کے عطا و خوف کے بعد امن کی بخشش اور کمزوری کے بعد طاقت کے
حصول کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ ہر امر میں اللہ کی عبادت اور اطاعت ہو اور شرک دور ہو، اگر واقعہ
اس کے خلاف ہوتا تو یوں کہا جاتا کہ عبادت الہی کی تعلیم اور رد شرک کی دعوت اس لیے ہے کہ خلافت

کا قیام ہوا اور سلطنت کا حصول ہو۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ اسلام جس دن سے مذہب بنا، اُسی دن سے وہ سلطنت بھی ہے اس کی مسجد اس کا دیوان اس کا منبر اس کا تخت تھا، اسلام کے جن بدگمان دشمنوں نے یہ سمجھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مذہب کی دعوت پیش کی، جب وہ کامیاب ہونے لگی اور جنگجو عربوں کا ایک گروہ ساتھ ہو گیا تو آپ کو سلطنت کے قیام کی فکر ہوئی ان کا یہ خیال سراسر اسلام کی حقیقت سے ناآشنائی پر مبنی ہے، ایسی بادشاہی اور سرداری تو خود قریش کے رئیس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس شرم کے ساتھ پیش کر رہے تھے کہ وہ ان کے بتوں کو برا نہ کہیں، لیکن آپ نے ان کی اس درخواست کو ہمیشہ ٹھکرا دیا۔ کیونکہ آپ کی دعوت کا مقصود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانی پادشاہی نہ تھی، بلکہ روئے زمین پر خدا واحد و برحق کی پادشاہی کا قیام تھا، اسی لیے اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی اور جنت سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لیکر اول ہی روز سے پیدا ہوا، اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دو نہیں ہیں، ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے، جس کے حدود حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے وہی آسمان پر حکمران ہے اور وہی زمین پر فرماں رواں ہے :-

فَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهُ وَرَبِّ
الَّذِي فِي الْأَرْضِ إِلَهُ وَرَبِّ ۚ (۱)

وہ دیویوں اور دیوتاؤں اور نمرودوں اور فرعونوں کو ایک ساتھ ان کے استخوانوں اور ایوانوں نکالنے کے لیے آیا تھا اور اس بات کی منادی کرتا تھا کہ آسمان ہو یا زمین، دونوں میں ایک ہی خدا کی حکومت ہوگی، اس کے آسمان میں نہ کوئی دیوی ہوگی، نہ دیوتا ہوگا، اور نہ اس کی زمین پر کوئی قیصر ہوگا اور نہ کسریٰ، جو اس دعوت کی راہ کار و راہے گا، اس کو راہ سے ہٹایا جائے گا اور جو اس کو روکنے کے لیے تلوار اٹھائے گا وہ تلوار سے گمراہ کیا جائے گا، سورہ منزل کے آخر میں جو آغاز وحی کے زمانہ کی سورت ہے، مسلمانوں کو ہتھیار کیا جلتے،

فَاَخْرَجْنَا مَضْجُورًا فِي الْأَرْضِ يَبْكُفُونَ
مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَالْآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي
سَبِيلِ اللَّهِ (مزمحل ۲۱)

یہ جنگ کی پیشینگوئی اُس زمانے میں سنائی جا رہی ہے جب کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ کبھی اسلام کے پیغام کو تیغ و سان کی زبان سے بھی سنانے کی نوبت آئے گی، گویا کہ اسلام کے آغاز ہی میں اس کا انجام معلوم تھا کہ لوگ اس دعوت کے قبول سے انکار کریں گے اور اس کو بزور روکنے کی کوشش کریں گے لہ سیرۃ ابن ہشام، و فد رؤسائے قریش کی گفتگو لے بعض روایات میں ہے کہ اس سورہ کے اول و آخر میں ایک سال کا فصل ہے، صبح مسلم باب ملوۃ اللیل و بیہقی و حاکم واحد :-

اور آخر مسلمانوں کو ان منکروں اور مخالفوں کے خلاف سر بجف میدان میں آنا ہوگا۔

مکہ میں توحید کا اعلان ہوا تو قریش کے ایک رئیس عقبہ نے دوسرے رئیسوں کے مشورہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی، سنو اے میرے بھتیجے! اس نئی دعوت سے تمہارا مقصود اگر مال و دولت ہے تو ہم تمہارے لیے اتنی دولت جمع کر دیتے ہیں کہ تم ہم سب سے زیادہ دولت مند ہو جاؤ، اور اگر تمہیں اپنی سرداری کا خیال ہے تو ہم تمہیں اپنا سردار مان لیتے ہیں کہ تمہارے فیصلہ کے بغیر کوئی کام نہ کریں گے، اور اگر تمہیں بادشاہ بننے کی فکر ہے تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بننے کو تیار ہیں، اس کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ فصلت کی آیتیں پڑھیں جن کو سننے ہی عقبہ حیرت میں آ گیا، اور واپس آکر قریش سے کہا کہ خدا کی قسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کلام پیش کرتے ہیں وہ نہ شاعری ہے، نہ جادو ہے اور نہ کاهنوں کی سی باتیں ہیں، قہرشی بھائیو! میری رائے یہ ہے کہ جو کلام میں نے اُن کے منہ سے سنا ہے وہ بے اثر نہیں رہ سکتا، اس لیے تم محمد کو اپنا کام کرنے دو، اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آگئے تو ان کی بادشاہی تمہاری ہی بادشاہی اور ان کی عزت تمہاری ہی عزت ہوگی، اور اگر ناکام رہے تو عرب خود ان کا خاتمہ کر دیں گے تمہیں انگلی بلانے کی بھی ضرورت نہ ہوگی، لیکن رئیسوں نے یہ کہہ کر کہ محمد نے عقبہ پر بھی جادو کر دیا، اس رائے کے ماننے سے بھی انکار کر دیا۔

کچھ دنوں کے بعد مکہ کے بڑے بڑے رئیس پھر اکٹھے ہوئے اور اس دفعہ سب نے مل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کی۔

۱۰۔ اے محمد! عرب کا کوئی آدمی ایسا نہ ہوگا جس نے اپنی قوم کو اس مصیبت میں پھنسایا ہو، جس میں تم نے اپنی قوم کو پھنسایا ہے تم باپ دادوں کو برا کہتے ہو، ہمارے مذہب میں عیب نکالتے ہو، ہمارے دیوتاؤں کو گالی دیتے ہو اور ہم کو نادان اور بے عقل بتاتے ہو تم نے ایک نئی بات نکال کر ہماری جماعت کے اتحاد میں فرق ڈال دیا، تو اگر اس کام سے تمہارا مقصود دولت کمانا ہے تو ہم تمہارے سامنے دولت کا ڈھیر لگا دیتے ہیں کہ تم ہم سب میں دولت مند بن جاؤ اور اگر تمہاری کا خیال ہے تو ہم تم کو سردار ماننے لیتے ہیں، اور اگر بادشاہ بننا چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں، اور اگر تم پر کسی جن کا سایہ پڑ گیا ہے تو ہم تمہارا علاج کرائیں گے۔

یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ان میں سے کسی بات کی بھی خواہش نہیں، مجھے نہ تو تمہاری دولت چاہیے، نہ تم پر سردار بننا چاہتا ہوں اور نہ تم پر حکومت کرنا میرا مقصد ہے مجھے تو خدا نے رسول بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور ایک کتاب مجھ پر اتاری ہے اور مجھے خدا سے حکم ملا ہے کہ اپنے رب کا پیغام سنو اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کرو، اگر تم اس کو مان لو گے تو دنیا اور دین دونوں میں تمہارا جلا ہوگا اور اگر تم نے نہ مانا تو میں صبر کروں گا، یہاں تک کہ میرے اور تمہارے درمیان خدا کا فیصلہ آجائے۔

ان دونوں تقریروں سے ظاہر ہو گیا کہ اسلام کا مقصد روم و ایران اور حیرہ و عسنان کی طرح کی شخصی یا قومی شان و شوکت کی بادشاہی نہ تھی، جو صلح و آشتی سے آسانی سے قائم ہو سکتی تھی، اس لیے قریش کی قومی

بادشاہی یا مجاز کی وطنی حکومت کی دعوت کا نظریہ پیش کرنا کافی تھا، لیکن معاملہ کی حقیقت اس سے بالکل الگ تھی، یہ دنیا کی اصلاح عالم کا اخلاقی و سیاسی انقلاب اور زندگی کا ایک ایسا نیا نظام تھا جس کی وسعت میں دین و دنیا کی ہر چیز آجاتی تھی اور اسی لیے اس کے لیے عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے قوت آزمائی کرنی تھی۔

قریش کے سردار آخری دفعہ حضرت ابوطالب کی خدمت میں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح ہو جائے، ابوطالب بھتیجے سے کہتے تھے، جان علم! یہ قریش کے سردار آئے ہیں وہ کچھ شرطیں سے لینا چاہتے ہیں اور وہ کچھ تم کو دینا چاہتے ہیں، ارشاد ہوا: اسے علم بزرگوار! میں صرف ایک بات چاہتا ہوں کہ وہ مان لیں جس سے وہ عرب کے بادشاہ ہو جائیں گے اور عجم ان کے زیر نگین ہوگا، ابوجہل نے کہا: ہم آپ کی ایک بات نہیں دس باتیں مانیں گے، ارشاد فرمایا کہ یہ مانو کہ ایک اللہ کے سوا کوئی دوسرا اللہ نہیں، اور خدا کے سوا جن کو پوجتے ہو ان سے دست بردار ہو جاؤ۔

حج کے موسم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جا کر توحید کی دعوت دیتے ہیں اور اپنی دعوت کو ان لفظوں میں پیش فرماتے ہیں اے لوگو! کہو کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، تم فلاح پاؤ گے، عرب تمہاری بادشاہی میں ہوگا اور عجم تمہارے تابع فرمان ہوگا اور تم جنت میں بادشاہ ہو گے۔ بیعت عقبہ میں جب مکہ والوں کے در سے مکہ کی ایک گھاٹی میں رات کو چھپ کر رسول انام علیہ السلام کے دست مبارک پر چنگنی کے نفوس جو مدینہ سے آئے تھے، بیعت کر رہے تھے تو انصار میں سے ایک خطیب نے اٹھ کر اپنی ایمانی بصیرت اور فراست سے کہا کہ یہ کیسی عظیم الشان حقیقت کا اظہار ہے، اسد بن زرارہ انصاری رضی اللہ عنہ نے حضور کے دست مبارک کو پکڑ کر لوگوں سے خطاب کر کے کہا: لوگو! تم کو معلوم ہے کہ تم آج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟ آج تم ان سے اس بات پر بیعت کر رہے ہو کہ تم عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے اس کے لیے لڑنے کو تیار ہو؟ سب نے کہا ہاں! انہوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ آپ اپنی شرطیں پیش فرمائیں، ارشاد ہوا: اقرار کرو کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور نماز کھڑی کرو گے، زکوٰۃ دو گے اور میری اطاعت کرو گے اور جو جس کام کا اہل ہوگا اس کو اس سے چھیننے کے لیے جھگڑا نہ کرو گے، اور جس سے تم اپنی اور اہل و عیال کی حفاظت کرتے ہو میری بھی کرو گے، انصاری نے ایک آواز سے کہا: ہاں! یا رسول اللہ آپ کی یہ سب باتیں منظور لیکن ہمیں اس سے کیا ملے گا؟ فرمایا جنت اور فتح و نصرت۔ یہ گویا شروع ہی سے معلوم تھا کہ اسلام کا کلمہ دعوت دین و دنیا کی بادشاہی کی کنجی ہے اور یہی معلوم تھا کہ اسلام جس صلح کے پیغام کو لیکر نکلا ہے، دنیا اس کا مقابلہ جنگ سے کرے گی، اور آخر تلوار کو تلوار سے

۱۔ سیرۃ ابن ہشام لہ طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۴۵، لایسنڈن تہ طبقات ابن سعد جز ثالت بدرمیں قسم ثانی ص ۱۳۹، لایسنڈن

گمراہ اور دنیا میں اسلام کے نظام میں کو قائم کرنے کے لیے عرب و عجم بلکہ جن و بشر میں سے جو راہ کا پتہ بن کر آئے گا۔ اس کو قوت سے توڑنا پڑے گا یہاں تک کہ خدا کا دین اپنے ہر معنی میں پورا ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام کی دنیاوی طاقت ہنوز دشمنوں سے محصور تھی مختلف موقعوں پر صحابہ کو بڑے بڑے شہروں اور ملکوں کی فتوحات کی خوشخبریاں دیں، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حضور کو ان واقعات کا علم دیا گیا تھا، انہیں معلوم تھا کہ جب مسلمان اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کریں گے تو وہ اپنا عہد بھی پورا کرے گا اور دنیا کی بادشاہیاں ان کے ماتحت ہوں گی اور بادشاہوں کے تاج ان کے پاؤں میں ڈال دے گا۔

غزوہ احزاب میں جو ہجرت کے چوتھے سال پیش آیا، مثنیٰ بھر مسلمان جو مدینہ کی کھلی آبادی میں تھے، حملہ آور عربوں کے نرغے میں گھر رہے ہیں، دم بدم خبریں آرہی ہیں کہ سارا عرب اپنی پوری متحدہ طاقت سیلاب کی طرح مدینہ پر امنڈنا چلا آ رہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور جان نثار صحابہ بھوکے پیاسے مدینہ کی حفاظت کی خاطر شہر کے چاروں طرف خندق کھود رہے ہیں کہ ایک بھاری پتھر سامنے آجاتا ہے جسکو مسلمانوں کے پھاوڑے اور کدالیں راہ سے ہٹانے سے عاجز ہو رہی ہیں، حضور تشریف لاتے ہیں اور اس زور سے اس پر تین دفعہ ایسی ضرب کاری لگاتے ہیں کہ پتھر چور چور ہو جاتا ہے اور لوہے اور پتھر کی دگر سے ہر ضرب جنگاری نکلتی ہے جس کی روشنی میں پہلے کسری کے شہر، پھر قیصر کے شہر اور تیسری دفعہ حبش کے شہر نظر آتے ہیں، اور حضور ہر دفعہ بلند آواز سے فرماتے ہیں، اللہ کی بات پوری ہوئی۔

اسلام کا آغاز جس بے الطیفانی اور بے سرو سامانی کے ساتھ ہوا اس سے کسی کو اس وقت خیال ہو سکتا تھا کہ یہ چند نیچے، ناقہ کش، غریب الدیار مسلمانوں کے بازوؤں میں چند ہی سال بعد یہ زور آئے گا کہ وہ قیصر و کسری کے تخت الٹ دیں گے، لیکن منجر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی وقت خبر دی تھی کہ مسلمانو! تم قسطنطنیہ فتح کرو گے۔ مدائن تمہارے ماتھے آئے گا، قیصر و کسری کے خزانے تمہارے تصرف میں آئیں گے، مہر کا تخت تم کو ملے گا، تم سے اور ترکوں سے جن کی آنکھیں پھوٹی اور چہرے چوڑے ہوں گے، جنگ ہوگی، ہندوستان تمہاری فوجوں کا میدان جہاد اور بحر روم تمہارے جنگی جہازوں کا جولان گاہ بنے گا، بیت المقدس کی کنجی ایک دن تمکو ملیگی لیکن ان خوشخبریوں، بشارتوں اور پیشینگوئیوں کے بحجم میں یہ بات بھولنا نہ چاہیے کہ یہ حکومت، یہ بادشاہی یہ تخت، یہ تاج، یہ خزانہ اسلام میں مقصود بالذات نہیں، یہ اس لیے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کے بہت سے مواقع کو دور کرنے میں معین ہیں، اور اسلام کے حدود اور قانون عدل انصاف کے اجراء کے ذریعے ہیں، اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو وہ اسلام کی حکومت نہیں خواہ وہ مسلمانوں کی ہو، دوسری بات یہ ہے کہ اس قوت و طاقت، شان و شوکت اور مال و دولت کو صرف خدا کی مرضی کے حصول میں صرف کیا جائے، اگر یہ نہ ہو تو یہ سلطنت، یہ عیش و عشرت، یہ دولت و حشمت اور جاہ و مال، سوء مال کا موجب ہو

۱۔ اندواقعات کے حوالے سیرۃ النبی جلد سوم میں پیشینگوئیوں کے بیان میں ہیں

جائے گا اس لیے ضروری ہے کہ کروفر سے جی نہ لگایا جائے اور نہ دل میں اس کی لو لگنے پائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ یہ دنیا کی سلطنت و حشمت اور مال و دولت دنیا کی نہیں بلکہ صرف آخرت کی آرائش کے لیے ہے دنیا آخرت کی کھیتی ہے، یہ کھیتی دنیا کے لیے ہے تو آخرت کے آرام سے محرومی ہوگی اور اگر آخرت کے لیے ہے تو دنیا اور آخرت دونوں ہی کے لیے فوز و فلاح کا موجب ہے:-

مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْفَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْفَ الدُّنْيَا نُؤَتْ بِهِ مِنْهَا وَمَالُهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ رَشِيدٍ (۳۰)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا خواستگار ہو، اس کو ہم اس میں سے دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو اس کو ہم اس میں سے دیں گے اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔

اور جو شخص دنیا میں اپنے اعمال کا بدلہ چاہے اس کو ہم یہیں بدلہ دے دیں گے، اور جو آخرت میں طلب ثواب ہو اس کو وہاں اجر عطا کریں گے اور ہم شکر گزاروں کو عنقریب بہت اچھا صلہ دیں گے۔

یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کو ہر قدم پر ہشیار کیا گیا ہے کہ دولت فانی کے پیچھے دولت باقی کو مت بھولو، کیونکہ یہاں کی لذت، عیش و عشرت، آرام و راحت اور دولت و سلطنت آخرت کے لذائذ ثواب اور نعمتوں کے مقابلہ میں بے شمار ہیں:-

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ مَّا ظَلَمُوا النَّبِيَّ هُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَهُمْ جُزْءُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ (دخل ۶۱)

اور جن لوگوں نے ظلم سننے کے بعد خدا کے لیے وطن چھوڑا، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔

جو لوگ اپنی غلطی سے دین کے فانی معاوضہ کو آخرت کے باقی معاوضہ کے مقابلہ میں ترجیح کے قابل سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ان لفظوں میں ہشیار فرمایا:-

أَرْضِيَتْكُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا إِلَّا خَيْرٌ إِلَّا قَلِيلٌ (توبہ ۶۱)

کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے تو دنیا کی زندگی کا فائدہ آخرت میں بہت معمولی ہے۔

اور جو ہر نعم کو دیکھ گئی ہے وہ دنیا کی زندگی کا فائدہ اور اس کی لذت ہے اور جو خدا کے پاس ہے، وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے، کیا تم نہیں سمجھتے۔

مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے۔

بَلْ تَوَثَّرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَى أَفَلَا تَعْقِلُونَ (قصص ۶۱)

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ مَّا ظَلَمُوا النَّبِيَّ هُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَهُمْ جُزْءُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ (دخل ۶۱)

اور آخرت کا گھر پر ہیزگاروں کے لیے بہتر ہے کیا تم سمجھتے نہیں۔

اسی طرح دنیا کی ہر تکلیف سے آخرت کی سرائیں بڑھ کر ہیں:-

وَإِذَا قُلْتُمْ لِلَّهِ الْخَيْرَ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (ذہر: ۳)

پھر ان کو خدا نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھا دیا اور آخرت کا عذاب تو بہت بڑا ہے کاش یہ سمجھ رکھتے۔

وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقَى (طہ: ۷۷)

اور آخرت کا عذاب بہت سخت اور بہت دیر رہنے والا ہے۔

اگر آخرت کا خیال کیے بغیر دنیا کے ذرہ ذرہ پر کوئی حکمرانی بھی کر لے اور دنیا کے مال و دولت سے اپنا گھر بھی بھر لے تو اس کی یہ ساری محنت اکارت اور یہ ساری دولت و حشمت بے سود۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبِطُلٌ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (سود: ۲۰)

جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طالب ہوں، ہم ان کے اعمال کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور انہیں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں، اور جو عمل انہوں نے دنیا میں کیے سب برباد اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب ضائع۔

دنیا کی ساری بادشاہی آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں پرکاش سے بھی کمتر ہے:-

فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ (توبہ: ۶۱)

دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابل بہت ہی کم ہیں۔

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ (درعد: ۳)

اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں بہت تھوڑا فائدہ ہے۔

اگر دنیا کے ساتھ آخرت کی دولت نہ ہو تو یہ دنیا کی لذت فریب اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں، اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔

اسلام یہ ہے کہ دنیا کے لیے نہیں، بلکہ دنیا کو آخرت کے لیے برتنا چاہیے جو کہ خطیوں میں یہ اکثر دہرایا جاتا ہے:-

إِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَآثَرُكُمْ خُلِقَتْ لِلْآخِرَةِ۔

دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔

قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ گود دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کے لیے ہیں۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَنَافِعَ
الَّذِي فِي جَمِيعِهَا۔
وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں
تمہارے لیے پیدا کیں۔

پھر دوسری جگہ بتایا کہ خود انسان کس لیے بنا۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ
إِلَّا لِيَعْبُدُونِ وَالْهَذَا رِيبَاتُ ۝۳۷
اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا
کہ وہ میری عبادت کریں۔

دنیا اور دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کو اس لیے ملیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا ذریعہ
بنایا جائے دنیا کے کاموں سے آخرت کی نعمتیں ملتی ہیں، یہ دنیا کی دولت اسی لیے دی گئی ہے کہ اس
آخرت کا سودا حاصل کیا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قارون کے قصہ میں بنی اسرائیل کے چند
مومنوں کی زبان سے اس حقیقت کو یوں ظاہر فرمایا ہے:-

وَابْتَغِ فِي مَالِكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ
وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا رِيبَ ۝۳۸
اور خدا نے تجھے دنیا میں جو کچھ دیا ہے اس آخرت
کو ڈھونڈ اور دنیا سے اپنا حصہ مت بھول۔

اسی معنوں میں دنیا مندرجۃ الآخرة (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) کا فقرہ زبان زد ہے۔

قرآن پاک کی وہی آیتیں جن میں اہل ایمان کو دنیاوی بادشاہی اور فتح و کامرانی کی خوشخبری دی
گئی ہے۔ ہمارے مقصد کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں، فرمایا گیا،

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا
الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ
حَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ
وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى
لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ
أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ
بِي شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ وَأَقِيمُوا
الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاطِيعُوا
الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (نور: ۵۵)

خدا نے ایمان اور عمل صالح والوں کو زمین کی سلطنت، تمکین اور امن عطا فرمائے جانے کی طرف
بتائی ہے، تاکہ وہ ہر مانع اور مخالفت طاقت سے بے پروا ہو کر میری اطاعت، عبادت اور میرے
احکام کی بجا آوری اور میرے قانون کا اجرا میں لگے رہیں، اور اگر اس امن و اطمینان اور ما

طاقتوں کے استیصال کے بعد بھی احکام الہی سے کوئی سرتابی کرے گا تو وہ نافرمان ٹھہرے گا، نماز
اقیام، زکوٰۃ کا انتظام و رسول کی اطاعت اللہ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:-

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
يُحِبُّونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ يَبْذُرُوا
بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ ۝۳۹
یہ وہ لوگ ہیں، کہ اگر ہم ان کو مانگے ہیں سترس دیں تو
نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کریں اور
اور بڑے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا
انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو زمین میں قوت عطا فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ
نماز کو جو حقوق الہی کی بجا آوری کا سرعنوان ہے قائم کریں، اور زکوٰۃ جو بندوں کے ادائے حقوق کا
دوسرا نام ہے ادا کریں، اور دنیا میں امور خیر کی تعمیل اور امور شر کے اسناد کا اہتمام کریں، اسلامی
سلطنت کا مقصد نہ جذبہ کا حصول نہ خراج کا وصول، نہ غنیمت کی فراوانی، نہ دولت کی ارزانی، نہ بجات
کا فروغ، نہ جاہ و منصب کا فریب، نہ عیش و عشرت کا دھوکہ اور نہ شان و شوکت کا تماشہ ہے،
بلکہ ستر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اس کے لیے جدوجہد اور سعی و محنت
کی ذمہ داری کا نام ہے۔

عہد نبوی میں نظام حکومت

عام خیال یہ ہے کہ اسلام کو عرب میں ایک عادلانہ نظام حکومت قائم کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں وہ تمام تر اہل عرب کی وحشت، بداوت اور جہالت کا نتیجہ تھیں، لیکن درحقیقت اس سے زیادہ یا اس کے برابر خود وقت کا تمدن بھی اسلام کے عادلانہ نظام حکومت کا دشمن تھا اور اس کی مخالفت وحشت سے زیادہ اور دیرپا تھی، چنانچہ ۸ ہجری میں فتح مکہ کے بعد اگرچہ وحشی عربوں نے اسلام کے سامنے اپنی گزینیں جھکا دیں لیکن وقت کے تمدن کا سرپرست و راب تک بلند تھا، چنانچہ نامہ اقدس کے جواب میں شہنشاہ ایران کا جواب اور قیصر روم کے حامیوں کے مقابلہ میں غزوہ موتہ وغیرہ واقعات جو سفر میں پیش آئے اور اس کے بعد خلافت راشدہ میں ایرانیوں اور رومیوں سے لڑائیاں اسی سرکشی و تمرد کا نتیجہ تھیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا زمانہ ہے، دنیا کی تمام سیاسی قوتیں مشرق و مغرب کی دو عظیم الشان طاقتوں کے زیر سایہ تھیں، مشرق کی نمائندگی فارس کے کسریٰ اور مغرب کی قسطنطنیہ کے قیصر کر رہے تھے اور ان دونوں کے ڈانڈے عرب کے عراقی و شامی حدود پر آکر ملتے تھے، عرب کے وہ قبائل جن میں ذرا بھی تہذیب و تمدن کا نام نہ تھا، وہ انہی دونوں میں سے کسی کے زیر اثر اور تابع تھے، یمن، بحرین، عمان اور عراق ایرانیوں کے اور وسط عرب اور حدود شام رومیوں کے ماتحت یا زیر اثر تھے۔

چنانچہ نخی خاندان نے مقام حیرہ میں ایرانیوں کی ماتحتی میں ایک وسیع سلطنت قائم تھی، جس کے فرمانروا نان بن منذر وغیرہ تھے، عسائی خاندان جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک قائم رہا، رومیوں کی سرپرستی میں حدود شام پر حکومت کرتا تھا یمن میں مدت تک خود عرب کی مستقل خاندانی ریاستیں قائم تھیں لیکن آخر زمانہ میں یمن خود ایرانیوں کے علم کے نیچے آگیا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یمن میں اذان نامی ایرانی حاکم موجود تھا، عرب پر ان سلطنتوں کا اس قدر اقتدار قائم ہو چکا تھا کہ خود عربوں کے ذہن میں جب کسی نظام سلطنت یا نظام تمدن کا خیال آتا تھا تو اسی ایرانی یا رومی نظام سلطنت اور نظام تمدن کا آتا تھا، ان سے الگ یا ان سے بالاتر کسی نظام زندگی کا تخیل ان کے ذہن کی گرفت سے بالاتر تھا۔

اس بنا پر اسلام عرب میں جو نظام حکومت قائم کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے صرف یہی کافی نہ تھا کہ عرب کی قدیم وحشت کو مٹا کر اسلامی تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈالی جائے۔ بلکہ سب سے مقدم کام یہ تھا کہ عرب کے غیر قوموں کے دماغی تسلط، سیاسی مرعوبیت اور ان کے اخلاقی و تمدنی اثر سے آزاد کرایا جائے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نہ صرف عربوں کو، بلکہ سارے عالم کو انسانوں کے خود ساختہ قانون کی غلامی سے نکال کر قانون الہی کی اطاعت و فرمانبرداری میں دیدیا جائے اور بتایا جائے کہ قانون الہی کو چھوڑ کر دوسرے انسانی قوانین کی پابندی

شرک کا دوسرا ستبہ لیکن جیسا کہ اسلام کے تمام فرائض و اعمال میں تہذیب و تدریج ملحوظ رہی ہے، اس طرح اسلام کے نظام حکومت میں بھی تدریج ترقی ہوتی گئی، چنانچہ اگرچہ آپ ساری دنیا کی اصلاح کے لیے آئے تھے مگر آپ نے اپنا کام عرب سے شروع کیا، تاکہ ایک ایسی صالح جماعت کا ظہور ہو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی اور آپ کے بعد بھی اس فرض کی تکمیل میں مصروف رہے، قرآن پاک کی یہ آیت اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے:-

وَكُنَالِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُوْنُوْا مَشٰوِرًا
عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنُوا لَكَ اٰمَنًا
شٰہیندہ (بقرہ ۱۴۳)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اس امت مسلمہ کے لیے اور یہ امت مسلمہ دوسری قوموں کی ہدایت و راہنمائی اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے بروئے کار لائی گئی ہے۔

لیکن یہی تدریجی ترتیب خود اہل عرب کی اصلاح میں بھی ملحوظ تھی، چنانچہ سب سے پہلے آپ نے عرب کے اندرونی حصے یعنی تمامہ، حجاز اور نجد کے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کیا اور آپ کے ۲۳ سالہ زندگی کے تقریباً سولہ سترہ سال انہی قبائل کی اصلاح و ہدایت کے نذر ہو گئے یہی وجہ ہے کہ مدینہ کے نخلت ان کی طرح اگرچہ ہجرو یمامہ کے سبزہ زار بھی اسلام کو اپنے دامن میں پناہ دینے کے لیے آمادہ تھے اور قبائل یمن کے ایک بڑے رئیس طفیل دوسی نے آپ کو قبیلہ مووس کے ایک عظیم الشان قلعہ کی حفاظت میں لینا چاہا تھا لیکن آپ نے ان متہدن مقامات کو چھوڑ کر مدینہ کی سنگلاخ زمین کو دارالہجرۃ بنایا، وہ اگرچہ منافقین اور یہود کی وجہ سے مکہ سے زیادہ پرخطر تھا اور ابتداء میں مہاجرین رضی اللہ عنہم کے لیے اس کی آب و ہوا بھی سازگار نہ تھی تاہم آپ نے اسی کی طرف ہجرت فرمائی لیکن جب رفتہ رفتہ عرب کے اس حصہ میں کافی طور پر نظام اسلام قائم ہو گیا اور صلح حدیبیہ نے عرب کے مرکز یعنی مکہ کا راستہ صاف کر دیا اور وہ فتح ہو گیا تو اب عرب کے دوسرے حصوں کی طرف توجہ کا وقت آگیا۔ اس بنا پر اسلام کے دائرہ عمل کو وسعت دی گئی اور عرب کے ان حصوں کی طرف توجہ فرمائی گئی۔

عرب کے اندرونی حصوں میں زیادہ تر اسلام کی اشاعت رؤسائے قوم اور سرداران قبائل کے ذریعہ سے ہوئی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حصوں میں بھی یہی طریقہ دعوت اختیار فرمایا چنانچہ سب سے پہلے قرب و حجاز کے سلاطین و رؤسا کو اسلام کی دعوت دی کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ان میں سے کسی ایک کا اسلام قبول کر لینا ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو قبول اسلام پر آمادہ کر دینا تھا، چنانچہ روم کے قیصر کو جو نامہ مبارک آپ نے لکھا تھا، اس میں یہ فقرہ تھا کہ اگر تم نے اسکو قبول نہیں کیا تو تمہاری ساری رعایا کے عدم قبول اسلام کا گناہ بھی تمہاری ہی گردن پر ہوگا، اس سے اگرچہ خود قیصر کا دل نور اسلام سے منور ہو چکا تھا، لیکن وہ اتنا کم تھا کہ تاج مرصع اور تخت زریں کی چمک میں یہ روشنی ماند پڑ گئی، بنجاشی بادشاہ حبش نے آپ کی رسالت کی تصدیق کی اور اپنے خاندان کے کچھ افراد کا وفد آپ کی خدمت میں روانہ کیا، یمن

کے تمام روسائے رفتہ رفتہ اسلام قبول کر لیا، عرب کے حدود میں ایک غسانی سلطنت تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اگرچہ پوری طور پر اس کا قلع قمع نہ ہو سکا تاہم غزوہ تبوک نے آپ کی حالتیں بدل دیں اس کا راستہ بھی بہت کچھ ہموار کر دیا تھا اور اب گویا سارا عرب اسلام کے سایہ کے نیچے تھا اور اس کا نظام حکومت سارے عرب پر چھا چکا تھا، اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا سب سے آخری فرض تمام دنیا میں اللہ تعالیٰ کی شہنشاہی کا اعلان تھا، چنانچہ حجۃ الوداع میں آپ نے ان بلیغ الفاظ میں اس کا اعلان فرمایا:

أَلَيْكُمُ اسْتِئْذَانُ الزَّمَانِ كَهَيْئَتِهِ يَوْمَ خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ - جس دن خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔

یہ ایک ایسا عظیم الشان انقلاب تھا جس نے تمام خود ساختہ قوانین، سیاسی تکلفات، بدعات اور مظالم سے لبریز شامِ زمانہ نظامِ مملکت کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دیا، اس انقلاب نے نہ صرف فطرتِ فیض کی شخصیتوں کا حاتمہ کر دیا، بلکہ خود کسرویت اور قیصریت کو صفحہ ہستی سے فنا کر دیا، یہی پیشین گوئی ان الفاظ میں ظاہر ہوئی:

إِذَا هَلَكَ كِسْرِي فَلَا كِسْرِي بَعْدَهُ وَإِذَا هَلَكَ قَيْصَرٌ فَلَا قَيْصَرَ بَعْدَهُ - جب کسری ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی کسری نہیں، اور جب قیصر ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں۔

اور اس کے بعد ایک ایسی عادلانہ سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی جس کا قانون خدا کا قانون جسکی حکومت خدا کی حکومت اور جس میں ہر شخص ایک طرح سے خود ہی اپنا حاکم اور خود ہی اپنا محکوم تھا، کیونکہ اسلامی سلطنت بادشاہ اور اس کے خاندان کی ملکیت نہ تھی، بلکہ ملکیت تو صرف ایک خدا کی تھی لیکن اس کی نیابت سارے مسلمانوں کا یکساں حق تھا، یا اس کو یوں کہیے کہ نظامِ اسلام میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اپنی رعایا کا نگرانِ حاکم ہے، شوہر اپنے اہل و عیال کا، بیوی شوہر کے گھر کی، معلم اپنے شاگردوں کا، آقا اپنے غلاموں کا، غلام اپنے متعلقہ کاموں کا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کا کہ كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ - یعنی تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر شخص سے اس کے زیر نگرانی اشخاص در رعیت کے متعلق سوال ہوگا، یہی مطلب ہے اس سے اسلام کے اصول سلطنت کا ایک اساسی نقطہ نظر سامنے آ جاتا ہے۔

دنیا میں جو سلطنتیں قائم ہوئیں یا ہوتی ہیں، ان کا عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک فاتح ایک گروہ کو لیکر اٹھتا ہے اور لاکھوں کو تہ تیغ کر کے اپنی طاقت و قوت سے سارے جتھوں کو توڑ کر ہزاروں گھروں کو ویران کر کے سب کو زیر کر کے اپنی سرداری اور بادشاہی کا اعلان کر دیتا ہے اور ان تمام خونریزیوں کا مقصد یا تو شخصی سرداری یا خاندانی برتری یا قومی عظمت ہوتی ہے، مگر اسلامی جنگ و جہاد اور اسلامی نظامِ حکومت کی جدوجہد میں ان میں سے کوئی چیز بھی ملحوظ نظر نہ تھی، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی سرداری، نہ خاندانِ قریش کی

بادشاہی نہ عربی سلطنت، نہ دنیا کی مالی حرص و ہوس، بلکہ اس کا ایک ہی مقصد تھا، صرف ایک شہنشاہِ رضی و سما کی بادشاہی کا اعلان اور ایک فرمانِ الہی کے آگے سارے بندگانِ الہی کی سرفرازی۔

دنیا میں سلطنتوں کے بانیوں کا مقصد قیامِ سلطنت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، لیکن اسلام جو سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا وہ بجائے خود مقصود بالذات نہ تھی، بلکہ اس کے ذریعے دنیا کے تمام ظالمانہ نظاموں کو مٹا کر جن میں خدا کے بندوں کو بندوں کا خدا ٹھہرا دیا گیا تھا، اس کی جگہ خدا کے فرمان کے مطابق ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا مقصود تھا جس میں خدا کے سوا نہ کسی دوسری ارغی و سماوی طاقت کی سلطنت ہو اور نہ کسی دوسرے کا قانونی راجح ہو اور جس میں فرمانروا افراد کی شخصیت، قومیت، زبان، نسل، وطن اور رنگ سے اس کو تعلق نہ ہو، بلکہ اس کی جدوجہد کا سارا منشا سلطنت کے قانون، طرز سلطنت، طریق حکومت اور عدل و انصاف اور احکام کے حق و باطل سے نہ ہو۔

اس مقصد کے لحاظ سے دنیا کی تمام قوموں میں سے عرب کا انتخاب، ان کی ظاہری و معنوی خصوصیات کے سبب سے ہوا، ظاہری تو اس لیے کہ وہ ایلان اور روم کے درمیان واقع تھے جو اس وقت کی فاسد دنیاوی طاقت کے منظر تھے، اور جن کو توڑنا اور فنا کرنا ضروری تھا اور اس کے لیے ایسی ہی دنیائی ہمسایہ قوم کی ضرورت تھی اور معنوی یہ کہ ایسی قوم کے انتخاب کے لیے جس کو اللہ تعالیٰ وقت کے فاسد نظامِ سلطنت کو مٹانے کے لیے کام میں لائے، کچھ فطری استعداد کی ضرورت تھی اور یہ استعداد اہل ہی سے نہیں دیوت رکھی گئی تھی عرب کی فطری شجاعت، کوہ شکن عزم و استقلال، زلزلہ انگیز قوتِ ارادی کا بڑا مقصد یہ تھا کہ یہ اخلاقی عناصر حکومتِ اسلامیہ کی تعمیر میں کام آئیں، اور ان اوصاف کی جلا، اخلاص، ثنیت، صبر و توکل و اعتماد علی اللہ وغیرہ اخلاقی روحانی ہی سے ممکن تھی، اس لیے اولاً ان کو اس طرز حکومت سے پاک رکھا گیا جس کو دنیا کی سلطنتوں نے اپنے شخصی و خاندانی اور قومی جاہ و جلال، رعیت و اقتدار، اور شان و ہیبت کو قائم رکھنے کے لیے اختیار کر رکھا تھا، مذکورہ بالا اخلاقی محاسن کے وجود بقا بلکہ ان کی ترقی و نشوونما کی ایک ہی صورت تھی کہ ایک شخص کے ہر تہ و ماہور من اللہ، ایک پاکباز راہنما، ایک مقدس امیر، ایک محصوم امام کے ہر توصیت اور تعلیم تربیت سے ان میں ایک ایسا تقویٰ، ایک ایسا پاک احساس، ایک ایسا روشن ضمیر، ایک ایسا نواہی مان پیدا کیا جائے جو بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہر فرد کو احکامِ الہی کے تحت میں سلطنت کے قوانین کی پابندی اور احترام پر خود مجبور کر دے۔

اس اصول پر جو نظامِ سلطنت قائم کیا جائے گا اس کے لیے دو شرطیں لازمی ہیں:

۱۔ یہ کہ وہ چند بنیادی اصولوں پر مبنی ہو۔

۲۔ یہ بنیادی اصول صرف خشک انسانی قانون پر مبنی نہ ہوں بلکہ اس کا اساس اولین معضی اخلاص قلب اور خدا تعالیٰ کی اطاعت ہو۔

اسلام کا نظامِ سلطنت انہی اصولوں پر قائم کیا گیا اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ تک قائم رہا

اس نظام سلطنت کا بڑا نتیجہ یہ تھا کہ اس میں قانون کے رو سے چھوٹے بڑے، اونچے نیچے، کالے گورے اور عربی و عجمی کی تفریق بالکل مٹ گئی، یمن اور بحرین کے ایران نژاد، نجد و حجاز کے عرب، حبش کے حبشی، سب ایک ہی سطح پر اکھڑے ہو گئے اور بادشاہی و شہنشاہی کے وہ تخت جو مشرق و مغرب میں بچھے تھے، الٹ گئے اور اسلام کی سلطنت کا امام اور دوسرے اہلکار حکام حقوق میں عام مسلمانوں کے برابر کر دیئے گئے۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام نے قانونی مساوات کی جو سلطنت قائم کی، وہ عرب کے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی کیونکہ اہل عرب فطرۃً خوددار تھے اور ان کے قبیلوں میں شیوخ کی ریاست قریب قریب اسی پر داذکی تھی مگر یہ سخت تاریخی غلطی ہے، عرب میں مدت سے تین سلطنتیں قائم تھیں، لجنی، حمیری، عنانی اور یہ سب کی سب اسی طرز کی تھیں جیسی دنیا میں دوسری شاہانہ حکومتیں تھیں، یمن میں سبا اور حمیر کی سلطنتیں بھی اسی قسم کی تھیں، اسلام سے کچھ ہی پہلے کندہ کی جو ریاست رومیوں کے زیر اثر قائم ہوئی تھی، وہ بھی اسی نقشہ پر تھی قبائل کے سردار اگرچہ جمہور کی مرضی یا ذاتی کردار مثلاً شجاعت و فیاضی وغیرہ کی بنا پر انتخاب کیے جاتے تھے لیکن ان کے حقوق بھی عام لوگوں سے ممتاز تھے، چنانچہ لڑائیوں میں جو مال غنیمت حاصل ہوتا تھا اس میں سرداران قبائل کے لیے خاص حقوق مقرر تھے جن سے اور تمام لوگ محروم تھے، یہی حقوق ہیں جن کو صفیہ مراء، نشیہ اور فقول کہتے ہیں اور اسلام نے انہی کو مٹا کر محض قائم کیا ہے عام مجالس میں لوگوں کو سرداران قبائل کے سامنے آزادانہ گفتگو کرنے کا بھی حق حاصل نہ تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر جو مذہب یسودی تھا، کہتا ہے:

وَلَا يَنْكُرُونَ الْقَوْلَ حِينَ نَقُولُ
وَلَا يَنْكُرُونَ الْقَوْلَ حِينَ نَقُولُ
اور اگر ہم چاہیں تو لوگوں کی باتوں کو رد کر دیں
اور جب ہم بولیں تو وہ لوگ اسکو رد نہیں کر سکتے
سرداران قبائل اپنے لیے جس چراگاہ کو مخصوص کر لیتے تھے اس میں دوسرے لوگوں کو قدم رکھنے کا بھی اختیار نہ تھا، چنانچہ حرب بسوس اسی بنا پر واقع ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے:
لَا حِمَى إِلَّا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ. اللہ اور رسول کے سوا کسی شخص کو چراگاہ کے مخصوص کر لینے کا حق حاصل نہیں ہے۔
اس کا مقصد اسی رسم کا مٹانا تھا۔

سلاطین شاہانہ شان و تجمل سے اونچے اونچے محلوں اور ایوانوں میں بڑے بڑے قیمتی لباسوں اور سونے چاندی اور زرد و سیاہی کے زیوروں سے آراستہ ہو کر اونچے اونچے پیش بہا تختوں پر جلو س کرتے تھے، ان کے امراء علی قدر مراتب سونے چاندی کی مرصع کرسیوں پر اور ریشمی گدوں پر بیٹھتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے یک قلم ان مصنوعی تفرقوں کو مٹا دیا، نشست کے لیے سونے چاندی کا سامان اور ریشمی لباس و فرش حرام کیے گئے، سونے چاندی کے زیورات مردوں کے لیے حرام ٹھہرے، امام وقت اور اس کے احکام کے لیے مسجد اور اس کا صحن ایوان تھا، حاجب و دربان کے پرے اٹھ گئے، چادش و نقیب رخصت کر دیئے گئے، طلائی و نقرئی وز مردیں تخت اٹھوا دیئے گئے، امام اور اس کے حاکم عام

مسلمانوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر نشست کرتے تھے، اور پستی و بلندی کی تفریق باقی نہیں رکھی گئی، چنانچہ وضع لباس کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام صحابہ میں کسی قسم کا فرق مراتب موجود نہ تھا، ایک مرتبہ ایک صحابی ایک شاہی عبا لیکر آئے، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرب کے مختلف حصوں سے وفود حاضر ہوا کرتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ آپ اسے خرید لیں تاکہ جب دوسرے شہروں یا ملکوں سے وفود آپ کی خدمت میں آئیں تو آپ اس کو زیب تن فرمائیں یا جمعہ کے دن جو گو یا مسلمانوں کے دربار عام کا دن ہے، آپ اس کو پہنیں، اس وقت حضرت عمر کی نظر اسلام کے لیے اس ظاہری جاہ و جلال اور ترک و احتشام پر گئی جس کے شاہان وقت عادی تھے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشتباہ کے اس پردے کو فوراً چاک کر دیا کہ مسلمانوں کا پیشوا شاہانہ جاہ و جلال کے اظہار کے لیے مبعوث نہیں ہوا ہے، آپ نے فرمایا کہ جو شخص اس کو پہنتا ہے آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔

اسی طرح نشست میں بھی آپ نے تفوق و برتری کے اعتبار کو اس قدر مٹایا کہ مجلس کے اندر آپ میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہ کی مجلس میں بیٹھتے تو باہر سے آنیوالوں کو لوپھنا پڑتا کہ تم میں محمد کون ہیں، لوگ اشارہ سے بتاتے، صحابہ نے چاہا کہ کم از کم ایک چہرہ ہی بنا دیا جائے، جس پر آپ جلوہ افروز ہوں، مگر اس کو بھی آپ نے پسند نہیں فرمایا۔
اس وقت کی شاہانہ حکومتوں میں بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد قانون کی زد سے مستثنیٰ تھے مگر

یہاں یہ حال تھا کہ ہر قانون الہی کی تعمیل کا اصل نمونہ اس کا رسول اور اہل بیت رسول تھے، اور اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ اگر نعوذ باللہ اہل بیت سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو، تو ان کے لیے دوہری سزا ہے، ایک بار ایک محترم خاتون فاطمہ بنت قیس نے چوری کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، چونکہ وہ معزز خاندان کی بی بی تھیں صحابہ کو یہ گراں گزرا اور انہوں نے آپ کی خدمت میں حضرت اسامہ بن زید کے ذریعہ سے سفارش کرانی چاہی، آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلے کی قومیں اسی لیے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی معمولی آدمی کوئی جرم کرتا تھا تو اس کو اس کی سزا دیدی جاتی تھی مگر جب وہی جرم بڑے رتبہ کے لوگ کرتے تھے تو انکو چھوڑ دیتے تھے پھر فرمایا کہ اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی یہ جرم کرتی تو میں یقیناً اسکا ہاتھ کاٹتا۔
ایک بار آپ صحابہ کو مال تقسیم فرما رہے تھے، ایک آدمی آیا اور حرص کے مارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ٹوٹ پڑا، آپ کے ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی، آپ نے اس سے کوہنچ دیا جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر زخم آگیا، آپ نے دیکھا تو اسی وقت فرمایا کہ آؤ اور مجھ سے قصاص لو، لیکن اس نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں نے معاف کر دیا۔

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت سی لونڈیاں آئیں، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھوں سے یہ حدیث بخاری کے متعدد ابواب میں موجود ہے مثلاً کراہۃ الشفاعة فی الحدود و اذاریع الی السلطان۔
لے ابو داؤد ج ۲ ص ۱۵۸، کتاب الحدود :

میں چلی پیتے پیتے چھالے پڑ گئے تھے، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاتھ دکھائے اور فرمایا کہ گھر کے کام کاغ کے لیے ان میں سے ایک لونڈی عنایت فرمائیے لیکن آپؐ نے فرمایا کہ بدر کے یتیم تم سے زیادہ اس کے مستحق ہیں۔ ابطال سود کا جب حکم آیا تو سب سے پہلے آپؐ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کے تمام سودی معاملات کو باطل قرار دیا، جاہلیت کے انتقام کے مٹانے کا جب قانون عام نافذ ہوا تو سب سے اول اپنے ہی خاندان کا انتقام جو دوسرے قبیلہ پر باقی چلا آتا تھا، معاف فرمایا، اسلامی محاصل زکوٰۃ و صدقات و عشر وغیرہ کے مستوجب ہونے اور ان کی ادائیگی میں خاندان نبوت بھی بالکل عام مسلمانوں کی طرح شریک تھا۔

اسی طرح بادشاہوں نے لوگوں کے دنوں میں اپنی عالیٰ نسب اور بلندی کا یہ تصور پیدا کر دیا تھا کہ وہ گویا ساری مخلوقات سے افضل ہیں، بخلاف اس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے جو خاص خطاب خدا سے پایا وہ یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، عبدیت کا ملہ ہی آپؐ کا کمال تھا، اعزاز کے وہ وہی طریقے جن کا سلاطین نے اپنے کو ایک زمانہ سے مستحق قرار دیا تھا، آپؐ نے ان سب کو مٹا دیا، فسر مایا خدا کے نزدیک سب سے بڑا نام یہ ہے کہ کوئی اپنے کو شاہ شاہان کے، ایک دفعہ آپؐ کو کسی نے سیدنا کہا تو فرمایا: یہ تو اللہ کے لیے ہے، آپؐ کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ لوگ آپؐ کو دوسرا نبیاء علیہم السلام پر فضیلت دیں۔

ایک بدسورج میں گھن لگا، چونکہ اسی دن آپؐ کے صاحبزادہ ابراہیمؑ کا انتقال ہو چکا تھا اور عریک خیال تھا کہ جب کسی بڑے آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو سورج میں گھن لگ جاتا ہے، اس لیے لوگوں نے اس واقعہ کو حضرت ابراہیمؑ کی موت کی طرف منسوب کر دیا، لیکن جب آپؐ صلوٰۃ کسوف سے فارغ ہوئے تو ایک خطبہ دیا جس میں اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ چاند و سورج خدا کی دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت دیتا ہے گھن نہیں لگتا۔ ایک بار ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس پر اس قدر رعب نبوت طاری ہوا کہ جسم میں رعشہ پڑ گیا آپؐ نے فرمایا کہ ڈرو نہیں، میں تو اُسی عورت کا لڑکا ہوں جو خشک کیا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔

ایک بار آپؐ کی خدمت میں ایک قیدی لایا گیا، اس نے کہا کہ خدایا میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں، محمدؐ کی طرف رجوع نہیں کرتا، آپؐ نے فرمایا کہ اس کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ حق کس کا تھا۔ حالانکہ یہ وہ فقرہ ہے جس پر سلاطین کی عدالت گاہوں سے پھانسی کی سزائیں دی جاسکتی تھیں کہ اس سے ان کے نزدیک ذات شاہانہ کی توہین متصور ہوتی ہے۔

ایک بار آپؐ نماز پڑھ رہے تھے، حالت نماز ہی میں ایک بدو نے کہا: خداوند! بھڑپو اور محمدؐ پر رحم فرما اور ہم دونوں کے ساتھ کسی پر رحم نہ کر۔ آپؐ نے سلام پھیرنے کے ساتھ ہی بدو کو ٹوکا کہ تم نے ایک وسیع چیز یعنی رحمت الہی کو محدود کر دیا۔ حالانکہ اس نے درباری زبان میں شاہانہ وفاداری کی سب سے بڑی علامت کا

لے ابو داؤد بخاری باب الکسوف ص ۳۵ مسند ابن جریر ج ۲ ص ۸۹ کتاب الادب ۵

انہما راں فقرہ میں کیا تھا، جس پر سلاطین زمانہ اکرام و انعام کی بارش کرتے تھے۔

سلطنت کے مفتوحات و محاصل کو دنیا کے بادشاہوں نے ہمیشہ اپنی ذاتی ملک سمجھا اور اپنے ذاتی و خانہ دانی عیش و آرام کے سوا ان کا کوئی دوسرا مصرف ان کے نزدیک نہ تھا اور اگر وہ اس میں سے دوسروں کو کچھ دیتے تھے تو اس کو اپنا احسان سمجھتے تھے لیکن جو نظام سلطنت اسلام نے قائم کیا تھا اُس میں سلطنت کے سارے محاصل مال اللہ یعنی اللہ کا مال کہلاتے تھے اور وہ صرف بیت المال کی ملکیت تھے اور مسلمانوں ہی کے لیے تھے، زکوٰۃ، صدقہ، خراج اور جزیہ جو کچھ وصول ہوتا تھا وہ اگرچہ ہمیشہ امیر سلطنت سب کا سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں آتا تھا، لیکن آپؐ نے اس کو اپنا نہیں بلکہ باخلاف شرائط عام مسلمانوں کی ملکیت قرار دیا اور کبھی اس کو اپنے شخصی تصرف میں نہیں لائے، زکوٰۃ کی ساری رقم اپنے اہل و عیال اور اپنے خاندان و شہر پر حرام فرمادی اور اس کو حکم الہی عام عزاء اور اہل حاجت کا حق قرار دیا اور اس کو علانیہ ظاہر نہ فرمایا، ابو داؤد میں ہے:

قال ما اوتيتكم من شیء وما
امنحكم ان انا الا خازن اضع حیث
ما امرت به

دوسرے موقع پر فرمایا:

انما انا قاسم و اقلع یعطی۔

میں تو صرف بانٹنے والا ہوں دینے والا تو خدا ہے۔

غنیمت کا مال بھی مجاہدوں ہی کو دیدیا جاتا تھا اور حضورؐ کو صرف ایک خمس یعنی پانچویں حصہ پر تصرف کا اختیار ہوتا تھا، اس تصرف کے معنی یہ ہیں کہ اس حصے سے حضورؐ اپنے اہل بیت کے علاوہ ان نادار اور محتاج مسلمانوں کو دیا کرتے تھے جن کو جنگ کے قواعد کے رو سے مالی غنیمت سے کچھ نہیں مل سکتا تھا، اسی طرح لڑائی کے بغیر جو علاقہ اسلام کے تصرف میں آتا تھا وہ حضورؐ کے تصرف میں گواہ براہ راست دے دیا جاتا تھا لیکن اس تصرف کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا کہ حضورؐ اس کی آمدنی اپنے صحابہ و سب سے اپنے خانگی ضروریات میں صرف فرمانے کے بعد اسلام کے ضروریات ہی میں صرف فرماتے تھے اور اعلان فرمادیا تھا کہ یہ مسلمانوں کے ضروریات ہی میں صرف ہوگی۔

صحابہ میں سے جو لوگ ایران و روم کے ظاہری جاہ و جلال اور چمک دمک دیکھ چکے تھے ان کو بھی یہ مفاد ملتا تھا کہ اسلام کے ظاہری رعب و وقار کے لیے ظاہری شاہانہ تزک و احتشام اور شان و شوکت بھی ضروری ہے، چنانچہ انہیں بار بار یہ خیال ہوتا تھا کہ آنحضرتؐ ساوگی و تواضع اور زہد و قناعت کے بجائے کاش ایسی ہی عیش و آرام کی زندگی بسر فرماتے جیسی روم کے قیصر اور ایران کے شہنشاہ بسر کرتے ہیں۔

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپؐ کے اُس حجرہ میں حاضر ہوئے جہاں آپؐ کی ضرورت کی چیزیں تھیں

لے ابو داؤد ج ۲ ص ۱۵ کتاب الخراج والا مارة ۵

تھیں، دیکھا تو آپ ایک چڑے کے تیکے سے جس میں کھجور کے پتے اور چھال بھری ہوئی تھی، ٹیک لگائے ہوئے ایک کھری چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور جسم مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں، حجرہ میں اصرار نگاہ دوڑائی لیکن تین سوکھے چڑوں کے سوا کوئی دوسرا ثاث البیت نظر نہ آیا، ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے تھے، اس منظر سے حضرت عمرؓ سخت متاثر ہوئے اور ان کی آنکھیں ڈبڈبائیں، حضورؐ نے دینے کا سبب پوچھا، عرض کی: اے اللہ کے نبی! میں کیوں نہ روؤں، جب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ دبستر نہ ہونے سے چٹائی کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے ہیں اور آپ کا سارا اثاث البیت میرے سامنے ہے اُدھر قیصر و کسریٰ ہیں جو باغ و بہار اور عیش و آرام کے مزے لوٹ رہے ہیں، اور حضورؐ اللہ کے رسول ہیں اور ان سے بے نیاز ہیں، ارشاد ہوا کہ اے ابن خطاب! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ہم آخرت لیں اور وہ دنیا؟ حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ ہاں! بے شک یا رسول اللہ! دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کی: یا رسول اللہ! دعا فرمائیے کہ خدا آپ کی امت کو فارغ البال کرے، کیونکہ رومی اور ایرانی باوجودیکہ خدا کی پرستش نہیں کرتے لیکن خدا نے ان کو تمام دینی و ساری سامان دیئے ہیں، آپ دفعتاً اٹھ بیٹھے اور فرمایا: کیوں ابن خطاب تم اس خیال میں ہو کہ رومی اور ایرانی تو وہ قوم ہیں کہ ان کو تمام لذائذ دنیا ہی میں دے دیئے گئے ہیں؟

اس تقریر دلپذیر کی تاثیر دیکھئے کہ وہی حضرت عمرؓ جو حضورؐ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے توڑک و احتشام اور عیش و آرام کی زندگی کی آرزو ظاہر کر رہے تھے، جب ان کی خلافت کا وقت آیا تو وہ بھی گودڑی اور مرغ ہی پہن کر اور جھونپڑے میں بیٹھ کر سونے چاندی اور زر و جوہر والے روم کے قیصر اور ایرانی کے کسریٰ پر حکمرانی کر رہے تھے اور ہر میدان میں ان کو شکست دے رہے تھے۔

قیس بن سعد ایک صحابی تھے، وہ حیرہ گئے اور وہاں دیکھا کہ لوگ وہاں کے مرزبان درمیس کے آگے سجدہ کرتے ہیں، ان پر اس کا خاص اثر ہوا اور انہوں نے دل میں کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، چنانچہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا خیال ظاہر کیا، آپ نے فرمایا: ایسا ہرگز نہ کرنا، اگر میں بالفرض کسی کو سجدہ کی اجازت دیتا تو بیویوں کو دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے ان سے پوچھا کہ کیا اگر تم میری قبر پر گزرو گے تو سجدہ کرو گے؟ عرض کی نہیں، تو فرمایا کہ تو میرا اب بھی نہیں کرنا چاہیے؟

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت معاویہؓ صحابی ایک نغمہ شام سے واپس آئے تو حضورؐ کو سجدہ کیا آپ نے حیرت سے فرمایا: معاویہ کیا؟ عرض کی: یا رسول اللہ میں نے رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے پیشواؤں اور افسروں کو سجدہ کرتے ہیں تو دل چاہا کہ میں بھی حضورؐ کو سجدہ کروں، ارشاد ہوا کہ خدا کے سوا کسی اور کو اگر میں سجدہ کرنے کو کہتا تو بیویوں کو کہتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔

لے بخاری و مسلم کتاب النکاح، باب لا یلاط یعنی بیوند اکر پڑ معارف ابن ابی داؤد کتاب النکاح کی ابن ماجہ کتاب النکاح:

ان تمام واقعات میں صاف نظر آتا ہے کہ اہل عرب خود اس کے شوگر تھے کہ وہ اپنے بادشاہوں اور پیشواؤں کو اپنے قرب و جوار کے سلاطین کی طرح عیش و آرام اور تزیّن و احتشام کے ساتھ دیکھیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم، اپنے تزیّن اور اپنے فیض اثر اور اپنے نمونہ سے دکھا دیا کہ یہ شکار ترفیع اور اسراف و تبذیر کی زندگی خدا کو محبوب نہیں اور اسلامی تعلیم کی نظر میں مرغوب نہیں، حیات دنیا کی یہ زینت و رونق سرب کی نمائش اور حجاب کی سرلمبندی سے زائد نہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس حقیقت کو بار بار ظاہر فرمایا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کامل نمونہ بن کر دکھا دیا، اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء راشدین اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اس کی پیروی کی، اور یہی سادگی و تواضع اسلام کا شعار قرار پایا۔

عام سلطنتوں میں محاصل کی عطا و بخشش شالہ نہ تقرب اور عیش پسند امراء کے مورد و مستحق اور سعی و سفارش کی بنا پر ہوتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دولت مندوں کی دولت مندگی اور فقراء کی محتاجی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام الہی کے تحت جو اسلامی نظام قائم فرمایا اس میں دولت مندگی اور تقرب نہیں، بلکہ حاجت اور ضرورت کو معیار قرار دیا گیا، کیونکہ منعفاء کا حق اقویاء کے مقابلہ میں زیادہ توجہ کے قابل تھا، عرب میں لونڈیوں اور غلاموں کا کوئی حق نہیں تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق میں ان کو بھی آزاد لوگوں کے ساتھ حصہ دیا، ابو داؤد میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک تھیلی لائی گئی جس میں کچھ مہنی مرے تھے، آپ نے ان کو لونڈیوں اور آزاد عورتوں پر تقسیم کر دیا، وظیفے جب تقسیم ہوتے تو آزاد شدہ غلاموں کو سب سے پہلے ان کا حصہ دیا جاتا ہے۔

سلاطین کی بارگاہ میں بے اجازت لب کشائی بھی جرم تھی، اور اجازت بھی ہوتی تو تکلفات و تصنیفات اور غلامی و عبودیت کے اظہار کے مختلف اسلوبوں کے بعد کہیں حرف مدعا زبان پر آتا تھا۔ اسلام کے نظام حکومت کا یہ حال تھا کہ حضورؐ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و جلالت اگرچہ صحابہؓ کو بارگاہ نبوت میں ایک طاثر بے جان بنا دیتی تھی، تاہم ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ بے تکلف عرض مدعا کرے، نا آشنا و آشنا تو یا محمد کہہ کر خطاب کرتا، اور حضورؐ خوشدلی کے ساتھ جواب دیتے، اور مسلمان یا رسول اللہ کہہ کر مطلب شروع کرتا تھا، آپ کے احکام کی تعمیل ہر مسلمان کا ایمان تھا، مگر جب اس کو یہ معلوم ہوتا کہ حضورؐ کا یہ حکم بطور مشورہ ہے تو بے تکلف اپنا خیال ظاہر کرتا تھا اور حضورؐ اس کو شفقت سے سنتے تھے اور اس کے قبول پر اس کو مجبور نہ فرماتے: اسلام کا قانون ہے کہ اگر کسی لونڈی کا نکاح اس کے مالک نے کسی غلام سے کر دیا تو آزادی کے بعد اس عورت کو حق ہے کہ چاہے اس نکاح کو قائم رکھے یا توڑ دے، حضرت بریرہؓ حضرت عائشہؓ رضی اللہ عنہا کی ایک لونڈی تھیں، وہ جب آزاد ہوئیں تو انہوں نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی، ان کے شوہر اس

غم میں روتے تھے آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریدہؓ سے فرمایا کہ تم ان کو اپنی شوہری میں لے
 لیتیں تو اچھا تھا، انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے؟ ارشاد ہوا کہ نہیں! سفارش ہے عرض
 کی تو قبول سے معذور ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ان سے کوئی مواخذہ نہیں فرمایا۔
 غزوہ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقام پر قیام فرمایا، فن جنگ کے بعض ماہر صحابہ نے عرض
 کیا یا رسول اللہ! آپ نے اس مقام کا انتخاب وحی سے فرمایا ہے، یا اپنی رائے سے؟ فرمایا: رائے سے، انہوں نے
 عرض کی یا رسول اللہ جنگی نقطہ نظر سے یہ مقام مناسب نہیں ہے بلکہ ہم کو بدر کے کنوئیں کے پاس آگے
 بڑھ کر ٹھہرنا چاہیے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بے تامل ان کی رائے پر عمل فرمایا، اسی قسم کے تجرباتی
 امور کے متعلق آپ کا ارشاد ہے کہ

انتم اعلموا بصور دنیا کما تم اپنے دنیاوی معاملات میں جسکا تعلق تجربات ہو تم زیادہ واقف ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں لوگوں کو دیکھا کہ نذرانہ کھجور کے رشتوں
 میں پیوند لگاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا تو خیال فرمایا کہ یہ ایسا ٹوٹکے کے لیے کرتے ہو گئے،
 اس لیے مشورہ دیا کہ تم یہ نہ کرتے تو اچھا تھا، چنانچہ انصار نے اس پر عمل کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ کھجوریں بہت کم
 اور خراب پیدا ہوئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر گزر ہوا تو دریافت فرمایا، انہوں نے صورت حال عرض
 کی تو ارشاد ہوا کہ میں نے اپنے گمان سے یہ بات کہی تھی، تم اپنے دینکے کاموں کو اچھا جانتے ہو، ان تمام امور میں
 جن کا تعلق وحی سے ہے، میری اتباع ضروری ہے، لیکن دنیاوی کاموں میں جن میں اپنی رائے سے کچھ کہتا ہوں
 تو میں بھی بشر ہوں تم آزاد ہو گئے

ان امور کے باب میں جن کا تعلق دنیاوی معاملات کے تجربوں سے ہے، یہ حدیث بڑی اہمیت رکھتی
 ہے لیکن جن امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم بالوحی ہوتا تھا اور وہ گویا مصلحت خداوندی پر مبنی ہوتا جس
 کی اطلاع حضور کو بذریعہ وحی ہوتی تو ان میں پھر کسی کا مشورہ تو جہ کے قابل نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ان کا منشأ حکم
 الہی ہوتا تھا جس کا ماننا نبی ضروری ہے اس میں بندہ کو دخل نہیں۔

غزوہ حدیبیہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت نرم شرائط پر صلح کر لی تو حضرت عمر
 رضی اللہ عنہ کو ذاتی طور پر محسوس ہوا کہ یہ صلح دگبی ہے اس لیے وہ جوش اسلام سے بے تاب ہو گئے اور
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ کیا پیغمبر برحق نہیں ہیں؟ آپ
 نے فرمایا: بے شبہ ہوں، انہوں نے کہا کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ ارشاد ہوا کہ بے
 شبہ ہیں، انہوں نے کہا: تو پھر ہم دین کے بارہ میں اس قدر کیوں دبتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میں خدا کا
 پیغمبر ہوں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتا، وہ میری مدد کرے گا انہوں نے کہا کہ کیا آپ نے ہم سے یہ نہیں کہا
 کہ صحیح بخاری، باب مکون الحرة تحت العبد وباب شفاعۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی زفۃ بریدہؓ۔ اگر اس لونڈی کا شوہر غلام
 ہو تو بالاختیار یہی حکم ہے، اگر آزاد ہو تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے لہٰذا صحیح مسلم باب الففائل ۱۰

تھا کہ ہم چل کر خانہ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں! لیکن کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اس سال کریں گے؟
 انہوں نے کہا: نہیں! آپ نے فرمایا: تو پھر آؤ گے اور طواف کر دو گے، لیکن حضرت عمر کو اس سوال و جواب سے
 جی تکین نہیں ہوئی تو حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے اور یہی گفتگو کی، انہوں نے بھی وہی جواب دیئے جو رسول
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیئے تھے، آخر میں جب اصل حقیقت ان کی سمجھ میں آگئی تو انہوں نے خود اپنی اس
 عرض و معروض کو گستاخی خیال کیا اور اس کے کفارہ میں صدقہ دیا، روزے رکھے اور غلام آزاد کیا، اس واقعہ
 سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے گو بہت کچھ عرض و معروض کی، مگر حضورؐ نے اپنے فیصلے کو نہیں بدلا،
 کیونکہ یہ فیصلہ ارادت ربانی سے کیا گیا تھا۔

اس طرح اسی واقعہ حدیبیہ میں جب شرائط صلح طے ہو جانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
 نے احرام کھول دیئے کا مشورہ مسلمانوں کو دیا، تو چونکہ ان کے شدت شوقی زیارت کعبہ کے خلاف یہ صورت
 پیش آئی اس لیے ان کو حزن و ملال ہوا اور اس کے سبب سے مسلمانوں نے تعمیل ارشاد میں تسائل برتا، جس سے
 ان کی عرض یہ تھی کہ حضورؐ یہ دیکھ کر غلاموں پر شفقت فرمائیں گے اور ان کی تمنا کے مطابق اپنی رائے کو بدل دیں
 گے لیکن جب آپؐ نے یہ دیکھا کہ لوگ اپنی رائے پر اڑے ہیں اور ان کا اس پر اصرار مصلحت ربانی کے خلاف
 ہے تو یہ امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر شاق گذرا اور مغموم ہو کر ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے
 پاس تشریف لے گئے، ام المومنین نے چہرہ مبارک پر آذر دگی کا اثر پاکر سبب دریافت کیا، آپؐ نے واقعہ
 بیان فرمایا، حضرت ام سلمہؓ نے مشورہ کے طور پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپؐ کسی سے کچھ نہ فرمائیں، آپؐ خود
 اپنا احرام کھول دیں چنانچہ آپؐ نے ایسا ہی کیا، شیعہ نبوت کے پروانوں و صحابہؓ نے یہ دیکھ کر سمجھ لیا کہ اب
 حضورؐ اپنے فیصلہ کو تبدیل نہیں فرمائیں گے، پھر تو یہ عالم ہوا کہ احرام کھولنے اور سر کے بال منڈوانے
 کے لیے لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔

اس واقعہ میں دونوں قسم کی مثالیں موجود ہیں، حدیبیہ کا فیصلہ چونکہ امر الہی سے تھا اس میں کسی کے
 مشورہ کی کوئی پرواہ نہیں فرمائی اور احرام کھلوانے کی تدبیر جو ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے عرض کی وہ
 ایک انسانی تدبیر تھی جس کا تعلق علم النفس اور امور تجربہ سے تھا، اس لیے اس پر بلا تامل عمل فرمایا گیا
 بعض ایسے واقعات بھی پیش آئے جن میں لوگ اپنی کم فہمی، نا عاقبت اندیشی یا اپنی بشری کمزوری کے
 سبب غفہ میں حضورؐ پر اعتراض کر بیٹھے، لیکن حضورؐ نے اس پر تحمل فرمایا اور معترض کو اس کی گستاخی کی کوئی سزا نہیں دی
 ایک دفعہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری صحابی میں آپؐ کی متعلق نزاع ہوئی، صورت یہ تھی کہ

لہٰذا بخاری ج ۱ ص ۳۸۰، کتاب الشرط لہٰذا اس قسم کے واقعات پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ خدا خواستہ علم النفس کا یہ نقطہ آنحضرت صلی اللہ
 علیہ وسلم سے بڑھ کر حضرت ام سلمہؓ کو معلوم تھا، بات یہ ہے کہ شاگردوں کے علوم و درحقیقت استادوں ہی کے فیض سے ہوتے ہیں
 جن سے کبھی ان (استادوں) کو اس لیے ذہول ہو جاتا ہے کہ وہ ان علوم و مسائل سے بھی زیادہ اہم مسائل میں مصروف ہوتے ہیں
 اس لیے اصرار کی پوری توجہ نہ ہونے سے شاگرد نے اس صورت کو پیش کر دیا جو اس کو خدا سنی استاد کے فیض سے حاصل ہوئی تھی

پہلے حضرت زبیرؓ کا کھیت پڑتا تھا اور اس کے بعد ان انصاری کا، انصاری چاہتے تھے کہ وہ پہلے پانی لیں، اور حضرت زبیرؓ چاہتے تھے کہ وہ ان کو نہ لینے دیں، آخر معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا، قانون اسلام کا تقاضا یہ تھا کہ جو زمین کو نہیں سے قریب تر ہو اسی کو پانی لینے کا حق ہے، دور کے کھیت والے کو یہ حق نہیں کہ وہ بلا اجازت قریب کے کھیت کو کاٹ کر اپنے کھیت میں پانی لیجائے، لیکن آپؐ نے حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ تم پہلے آبپاشی کر لو، پھر پانی کو اپنے پڑوسی کے کھیت میں جانے دو، یہ ایک اخلاقی اور منصفانہ فیصلہ تھا۔ لیکن اس فیصلہ پر تقاضائے بشری سے وہ انصاری سخت برہم ہو گئے اور کہا کہ یا رسول اللہ! آپؐ نے یہ فیصلہ صرف اس بنا پر کیا ہے کہ زبیرؓ آپؐ کے پھر بھی زاد بھائی ہیں، یہ سن کر آپؐ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، تب آپؐ نے اخلاقی فیصلے کے بجائے قانونی فیصلہ دیا، اور حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ زبیر! آبپاشی کر کے پانی روک لیں یہاں تک کہ کھیت کی مینڈ تک پہنچ جائے، یعنی پانی بہہ کر مینڈ کے اوپر سے دوسرے کے کھیتوں میں ان خود چلا جائے، یوں نہ جانے۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مال غنیمت کی تقسیم فرما رہے تھے، قبیلہ بنو تمیم کا ایک شخص جس کا نام ذوالخویرہ تھا، آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ! انصاف فرمائیے! آپؐ نے فرمایا اگر میں انصاف نہ کروں گا تو کون کرے گا؟ ذوالخویرہ کی اس گستاخی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آگیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اگر آپؐ اجازت دیجئے تو اس کی گردن اڑاؤں، لیکن آپؐ نے ان کو روک دیا اور فرمایا کہ اس کے کچھ ہمراہی ایسے ہوں گے جن کی عبادتوں کے سامنے تم کو اپنی عبادتیں حقیر معلوم ہوں گی، یہ قرآن پڑھیں گے لیکن وہ اس کے گلے کے نیچے نہیں اترے گا، یہ مسلمانوں کے تفرقہ کے زمانہ میں اپنی جماعت الگ بنائیں گے (یہ پیشین گوئی امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خوارج کے ظہور سے پوری ہوئی)۔

یہ دونوں اعتراض اگرچہ عرض واجب کی حد سے گذر کر گستاخی کی حد تک پہنچ گئے تھے اور عجب نہیں کہ ان میں سے بعض نکتہ چین منافق ہوں، تاہم اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی اپنی جہالت اور غلط فہمی سے بڑے اسلوب سے بھی آپؐ پر اعتراض کرتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کرم و شفقت سے اس کا تحمل فرماتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل میں آپؐ کے بعد آنے والے خلفاء اور امرائے اسلام کے لیے حق شناسی، حق کشی، حق گوئی اور حق کی پیروی میں ذاتی جاہ و اعزاز اور فخر و غرور کو دخل نہ دینے کی کتنی بڑی تعلیم تھی۔

عمل و حکام در حقیقت خلیفہ یا بادشاہ کے قائم مقام ہوتے ہیں اس لیے ان پر نکتہ چینی کرنا گویا خود خلیفہ پر یا بادشاہ پر نکتہ چینی کرنا ہے، عہد نبوت میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے عمال نبوی کی شکایت کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے اس کے کہ قانون کی کسی دفعہ سے ان کو خاموش کر دیا ہو، یا حکام کی حمایت میں معترضین پر کسی قانونی جرم کو عائد فرمایا ہو، اخلاقی طور سے دونوں کو سمجھا دیا، حکام و عمال

لہ ابو داؤد، کتاب الفقہ ج ۲ ص ۶۶، تہ بخاری جلد اول ص ۵۰۹ باب علامات النبوة فی الاسلام

فرمایا: ہاں مظلوم کی بدعا سے بچتے رہنا کہ ان کی دعا اور قبول میں کوئی چیز خارج نہیں ہوتی، اور معترضین سے فرمایا کہ تم اپنے عاملوں کو اپنے عمل سے راضی رکھو۔

لیکن ان سب سے زیادہ سخت وہ مواقع ہیں جہاں بعض لوگوں نے خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے درستی اور سختی کے ساتھ مطالبہ کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے معترضین کے ساتھ بھی لطف کرم فرمایا، اور عدل و انصاف سے بھی زیادہ ان کو عطا فرمایا۔

ایک بار ایک اعرابی نے آکر آپؐ کی چادر پکڑ لی اور اس زور سے کھینچی کہ آپؐ کی گردن سرخ ہو گئی آپؐ اس کی طرف پھرے تو اس نے کہا میرے ان دونوں اونٹوں کو لادو، کیونکہ جو لادو گے وہ نہ تمہارا مال ہوگا اور نہ تمہارے باپ کا، حضورؐ نے قین بار فرمایا: نہیں! استغفر اللہ، نہیں استغفر اللہ، نہیں استغفر اللہ، اس کے بعد فرمایا: میں اس وقت تک نہیں لادوں گا جب تک تم نے جو اس زور سے مجھے کھینچا ہے، اس کا بدلہ نہ دو، مگر وہ اس سے انکار کرتا رہا، پھر آپؐ نے معاف فرما کر حکم دیا کہ اس کے ایک اونٹ پر جو اور دوسرے پر کھجوریں لاد دی جائیں۔

ایک دن ایک بدو آیا، جس کا کچھ قرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا، بدو عموماً سخت مزاج ہوتے ہیں، اس نے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی، صحابہؓ نے اس گستاخی پر اس کو ڈانسا اور کہا: تجھ کو خبر ہے کہ تو کس سے ہمکلام ہے؟ بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ اس کا حق ہے، اس کے بعد قرض ادا کرنے کا حکم فرمایا، اور اس کو اس کے حق سے زیادہ دلوادیا۔

ایک دفعہ ایک بدو اونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال یہ تھا کہ گھر میں چھوہ مارے موجود ہیں، آپؐ نے ایک دسق چھوہ ماروں پر گوشت چکالیا، گھر میں آکر دیکھا تو چھوہ مارے نہ تھے، باہر تشریف لا کر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہ ماروں پر گوشت چکایا تھا، لیکن چھوہ مارے میرے پاس نہیں ہیں اسے واویلا چھوہ مارے بد معاملگی، لوگوں نے سمجھا یا کہ رسول اللہ بد معاملگی کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں، اس کو چھوڑ دو اس کو کہنے کا حق ہے، پھر قصاب کی طرف خطاب کر کے وہی فقرہ ادا کیا، اس نے پھر وہی لفظ کہے لوگوں نے پھر روکا، آپؐ نے پھر فرمایا، اس کو کہنے دو، اس کو کہنے کا حق ہے اور اس جملہ کو کوئی بار دہراتے ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے ایک انصاریہ کے ہاں اس کو بھیجا دیا کہ اپنے دام کے چھوہ مارے دہاں سے لے لے جب چھوہ مارے لیکر لپٹا تو آپؐ صحابہؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے، اس کا دل آپؐ کے حلم و عفو اور حسن معاملہ سے متاثر تھا، دیکھنے کے ساتھ بولا: محمد! تم کو خدا جزائے خیر دے، تم نے قیمت پوری دی اور اچھی دی۔

بہر حال یہ تو مسلمانوں کے ساتھ کے معاملے تھے، ان سے بڑھ کر وہ واقعات ہیں جو یہودیوں کی بے جا و ناروا بیہودگیوں کے مقابلہ میں پیش آئے، جن کی حیثیت ایک ذمی رعایا کی ہو چکی تھی۔

لہ صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۶۶، کتاب الزکوٰۃ، باب ارضاء الساعۃ لسنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب العلم تلک ابن ماجہ صاحب الحج

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے لین دین کا کاروبار کرتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا کچھ قرض لیا، میعاد ادائی میں ابھی کچھ دن باقی تھے کہ تقاضے کو کرنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر پکڑ کر کھینچی اور سخت و سخت کہہ کر کہا کہ اے عبدالمطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یوں ہی جیلے حوالے کیا کرتے ہو، حضرت عمر غرض سے بیتاب ہو گئے، اس کی طرف منہ کر کے کہا: اور خدا کے دشمن! تو رسول اللہ کی شان میں گستاخی کرتا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر کہا: عمر! مجھ کو تم سے اور کچھ امید تھی، اس کو سمجھانا چاہیے تھا کہ وہ نرمی سے تقاضا کرے، اور مجھ سے کہنا چاہیے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں، یہ فرما کر حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو ارشاد ہوا کہ جاؤ اس کا قرض ادا کر کے اس کو بیس صاع کھجور کے اور زیادہ دیدو، یہودی علم و عفو کے اس پُر اثر منظر کو دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔

ایک دفعہ آپ کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا، اور وہ بھی موٹا اور گندہ تھا، پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا، اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے، حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ ایک جوڑا اس سے قرض منگوا لیجئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا، اس گستاخ نے کہا: میں سمجھا، مطلب یہ ہے کہ میرا مال یونہی اڑالیں اور دم نہ دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ناگوار جملے سن کر صرف اس قدر فرمایا کہ وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنا چاہتا ہوں۔

ان واقعات کے ذکر سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم، جو پیغمبر ہونے کے علاوہ ایک امیر کی حیثیت بھی رکھتے تھے، لوگوں نے اس حیثیت سے آپ پر جو سختی سے سخت اعتراض کیا، آپ نے اس کو کس علم اور عفو سے سنا، اور معاملہ کا فیصلہ کیا، یا واقعہ کی تفصیل فرما کر لوگوں کی تسلی کر دی، ذرا اسلام کے امیر کو زمانہ کے سلاطین اور امراء کے عز و تبحر سے ملایئے جو رعایا کی ذرا ذرا سی بے ادبی اور گستاخی پر ان کو سخت سے سخت جبر تک سزائیں دیتے ہیں اور ان کا قانون اس کو جائز قرار دیتا ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کے قانون کی سب سے پہلی دفعہ یہی ہے کہ ذات شام نہ ہر مواخذہ سے بری اور ہر دار و گیر سے برتر ہے اس سے بھلا بڑا جو کچھ ہو، وہ قانون کی گرفت سے باہر ہے لیکن اسلام کے قانون کی نظر میں امیر مامور حاکم و محکوم اور راعی و رعیت قانون کی دار و گیر اور سزا اور مواخذہ میں بالکل یکساں ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معصوم تھے جن کا ہر قول و فعل جائز و حدود سے کبھی باہر نہیں ہو سکتا تھا بلکہ تمام تر مستحسن ہی ہوتا سا، اور آپ کی خدمت اقدس میں ذرا سی گستاخی بھی ایمان سے محروم کر کے واصل جہنم کر سکتی تھی، بائیں ہمہ آپ کے ذاتی کاروبار اور حکومت کے معاملات کی نسبت سوال و جواب اور استفسار کی جرأت کو جائز رکھا جانا صرف اس لیے تھا کہ آپ کا یہ اسوہ آئندہ امت کے لیے تعلیم کے لیے عملی سبق ہو، اور اس کے لیے غایت شفقت سے خود زحمت برداشت فرماتے تھے تاکہ آئندہ آنے والے روایت بہت سی، ابن جان، طبرانی اور ابونعیم نے روایت کی ہے اور سیوطی نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے (شرح شفاء از شہاب خفاجی) لے جامع ترمذی، کتاب البیوع :

ولے امراء اور حکام استفسار و اظہار رائے کے دروازے کو امت پر بند نہ کریں۔

عہد نبوت میں جو متمدن سلطنتیں تھیں، ان میں ایران نے کبھی ذات شام نہ پر اس رو در سوال و جواب استفسار اور اعتراض کا جواب بھی نہیں دیکھا تھا، لیکن وہ جمہوری سلطنتیں درحقیقت امراء کی تھیں، ان کا تعلق عوام سے نہ تھا اور نہ ان کو امراء کے مقابلے میں یہ حق سوال و مواخذہ حاصل تھا اور نہ ان کے امراء و حکام میں اس تواضع، اس خاکساری، اس عفو و حلم، اس انصاف اور اخلاق کی بلندی کا یہ منظر نظر آیا، اور نہ آسکتا تھا، وہ اخلاص قلب و صداقت اور پاکیزگی اخلاقی کے اس بلند نصب العین کی گود کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ وطن ان کا دیوتا تھا اور وہ اس کے پجاری تھے اور وہ اس دیوتا کے لیے سب کچھ کر سکتے تھے اور ان کا وطن چار دیواری میں محدود تھا، جس کے باہر گویا انسان نہیں بستے تھے، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے امیر کی قانونی حیثیت کی یکسانی کی وہ نظیر پیش کی جس سے دنیا ہنوز نا آشنا تھی، اس حقیقت پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیجئے کہ یہ نفس امیر سے سوال و استفسار کی صورت نہیں ہے، بلکہ اس ذات اقدس سے ہے، جس کی خاک عقیدت مسلمانوں کی چشمہ ادب کا سرمہ تھی اور جس کی حیثیت محض ایک امیر اور حاکم کی نہ تھی بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کر ایک معصوم رسول اور ایک پاک نبی کی تھی، صلوات اللہ تعالیٰ علیہ۔

اس کے بعد سلطنت و امارت اور حکومت کے کاروبار میں اہل رائے مسلمانوں سے مشورہ لینے کا معاملہ ہے ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وحی سے قطع نظر کر کے بھی آپ عقل و دانش اور علم و فہم میں تمام لوگوں سے اعلیٰ اور برتر تھے اور ظاہر ہے کہ جو شخص عقل و فہم و دانش کے اس تہ پر ہوا سکو اپنے سے کم تر لوگوں سے معاملات میں مشورہ لینے کی ضرورت نہ تھی لیکن آپ مشورہ کرتے تھے، ایک تواسیلے کہ انے رائے لینے میں اسکا دل بڑھے اور دوسرا اس لیے کہ چونکہ آپ کا ہر فعل اسلام کی شریعت کا قانون بن جاتا ہے، ایسے آپ کا یہ فعل یعنی مشورہ کرنا بعد کے انبوالے خلفاء و امراء کے لیے مثال و نظیر کا کام دے، آپ کو یہ حکم الہی ہوا کہ

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران: ۱۵۷) اے رسول! امور سلطنت و جنگ و صلح میں اپنے رفیقوں سے مشورہ لے لیا کیجئے۔

چنانچہ حضور نے اس پر بنفس نفیس عمل فرمایا اور مسلمانوں کو بھی عمل فرمانے کی ہدایت فرمائی، انہوں نے عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی اور ان کی خصوصیت ظاہر کی کہ

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (شوری: ۲۳) ان (مسلمانوں) کے معاملات باہمی مشورہ سے انجام پاتے ہیں۔

اگرچہ عہد نبوت میں حکومت کے سارے اجزاء وجود پذیر نہیں ہوئے تھے اور نہ چنداں ان کی ضرورت تھی تاہم احادیث کے تتبع و استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت سے متعلق متعدد اہم امور کے متعلق صحابہ سے مشورہ فرمایا، اور ان کی رائے پر عمل کیا، اور اس کا منشا صرف یہی ہو سکتا ہے کہ عام مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اس قسم کے انتظامی امور میں باہم مشورہ کر لینا تاکہ مفید نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہو، نہایت

مناسب ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی چنداں حاجت نہ تھی۔

مدینہ پہنچ کر جب مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور نماز باجماعت ادا ہونے لگی تو پہلا مرحلہ یہ پیش آیا کہ تمام لوگوں کو کیونکر ایک مسجد میں جمع کیا جائے، اس کے متعلق ہنوز وحی بھی نہیں آئی تھی اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ فرمایا، یہود و نصاریٰ کے یہاں ایسے موقع پر بوق و ناقوس بجایا جاتا تھا بعض لوگوں نے اسی کا مشورہ دیا، بعض لوگوں نے نماز کا وقت ہونے پر علم بلند کرنے کی رائے دی، لیکن آپ نے ان میں سے کسی رائے کو پسند نہیں فرمایا، آخر میں حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ ایک آدمی کو بھیج کر نماز کا اعلان کرایا جائے تو آپ نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا، انہوں نے الصلوٰۃ جامعۃ کھکھریکا، اس کے بعد ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو روپا میں اذان کی موجودہ صورت دکھائی گئی اور فیض تاثیر سے بعض دوسرے صحابہؓ نے بھی اسی قسم کا خواب دیکھا اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا، چنانچہ آپ نے اسی طریقہ کیطابق حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا۔

بدر کے موقع پر شہر سے باہر نکل کر یا میدان جنگ کے قریب پہنچ کر آپ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ دشمن کا مقابلہ کیا جائے یا نہیں؟ باری باری سے ممتاز صحابہؓ نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی، یہاں تک کہ ایک رئیس نے اٹھ کر کہا کہ یا رسول اللہ! ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں جو پیغمبر سے یہ کہہ دیں کہ تم اور تمہارا رب جا کر میدان جنگ میں دشمنوں سے لڑے ہم تو یہیں رہیں گے، خدا کی قسم اگر آپ سمندر میں بھی جانے کو فرمائیں گے تو ہم چلے جائیں گے اس کے بعد جب آپ میدان جنگ کی طرف بڑھے تو ایک مقام پر جا کر پڑاؤ ڈالنا چاہا، ایک تجربہ کار صحابی نے آکر عرض کی یا رسول اللہ! آپ حسب فرمان الہی اس مقام پر لشکر کا پڑاؤ ڈالنا چاہتے ہیں یا حضور کی یہ اپنی رائے ہے؟ ارشاد ہوا کہ یہ میری رائے ہے، اس پر انہوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم کو بدر کے ایسے مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہیے تاکہ پانی اپنے قبضہ میں رہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رائے کو پسند فرمایا، اور وہیں جا کر قیام فرمایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب بدر کے قیدی پیش کیے گئے تو آپ نے پھر تمام صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کون سا طرز عمل اختیار کیا جائے، لوگوں نے مختلف رائے دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرؓ کی رائے کی مطابق فدیہ لیکر ان کو رہا کر دیا۔

احد کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہؓ سے مشورہ چاہنا کہ ہم شہر سے باہر نکل کر جگہ آوروں کا مقابلہ کریں یا شہر کے اندر رہ کر ان کا دفاع کریں، اس پر عبداللہ بن ابی بن سلول منافق مدینہ کا رائے دینا کہ شہر کی گلی کوچوں میں رہ کر مقابلہ کیا جائے، پھر بڑبڑ جہاں شام صحابہؓ کا عرض کرنا کہ حضور شہر کے باہر نکل کر ہم کو لڑنا چاہیے اور حضور کا صحابہؓ کی رائے کے مطابق شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا امور حکومت میں مشورہ کی بہترین مثال ہے۔

۱۔ مصنف عبد الرزاق و طبقات ابن سعد و کتاب المراسل لابن داؤد و فتح الباری ابن حجر و در من الانف سلی (بقیہ صفحہ آئندہ)

مغزوہ حنین میں جب قبیلہ ہوازن کا وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ہمارا جو سال غنیمت میں آپ کے پاس آیا ہے، واپس کر دیا جائے، آپ نے فرمایا کہ قیدی اور مال دونوں واپس نہیں مل سکتے ان میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہوگا، ان لوگوں نے قیدیوں کو انتخاب کیا، اور آپ نے ان کی درخواست قبول کر لی اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کسی کو سرتابی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی، پھر بھی آپ نے تمام صحابہؓ کو جمع کر کے ایک خطہ دیا جس میں فرمایا کہ تمہارے یہ بھائی کفر سے تائب ہو کر آئے ہیں، اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان کے قیدیوں کو واپس کر دوں اب تم میں جس کے دل میں جو آئے وہ کرے، جس کو مجھ سے اتفاق ہو وہ میری رائے پر عمل کرے اور جن لوگوں کو میری رائے سے اتفاق نہ ہو، وہ اس وقت قیدیوں کو آزاد کر دیں، جس وقت پہلا مال غنیمت آئے گا، ان کو اس کا معاوضہ دیدیا جائے گا، تمام لوگ یک زبان ہو کر بول اٹھے کہ یا رسول اللہ! ہم اس پر راضی ہیں، آپ نے ان کے اس عاجلانہ اظہار رائے کو کافی نہیں سمجھا، فرمایا کہ ہر شخص کی رائے معلوم ہونا ضروری ہے کہ کون راضی ہے، اور کون راضی نہیں ہے؟ اس لیے ہر شخص کو اپنا ایک قلمقام و عرفین ہمارے پاس بھیجنا چاہیے، چنانچہ ان قائلین نے تمام لوگوں سے گفتگو کر کے آپ کو ان کی رضامندی کی اطلاع دی۔

احادیث کی کتابوں کا استقصاء کیا جائے تو اور بھی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد مبارک میں حکومت کے انتظامی امور میں صحابہؓ سے مشورہ لیتے تھے اور ان کے مشوروں کو اگر پسند فرماتے تو ان پر عمل بھی فرماتے تھے۔

قیام سلطنت اور آئین سلطنت کے باب میں اسلام کا ایک فیض یہ بھی ہے کہ اس نے سلطنت کو بھی مذہب اور عبادت بنا دیا، اس شعبہ حیات کو جس میں تمام تردد و زندگی، بہیمیت، مکر و فریب، و غل و سازش ظلم و ستم اور جور و تعدی شامل تھی، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ سیاست کی راہ میں ہر گناہ ثواب ہے، اسلام کی تعلیم نے اتنا پاک بلند کیا کہ وہ عرش کا سایہ بن گیا، احادیث میں متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ السلطان ظل اللہ، فی الارض یا ولی الیہ کل من ظلم من عباد اللہ یعنی صالح حکومت زمین میں اللہ کے امن کا سایہ، جس کے امن میں بندگان الہی میں سے ہر مظلوم پناہ پاتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا قول ہے کہ

السلطان العادل للتواضع ظل اللہ و عادل اور متواضع حاکم زمین میں خدا کا سایہ اور رحمہ فی الارض ہے۔ اس کا نیزہ ہے۔

(بقیہ حاشیہ) و زرقانی علی المواہب و نوذی شرح مسلم باب بدر الاذان، نوذی میں ہے فشرع عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد ذلک اما بوجی و باجتهادہ صلی اللہ علیہ وسلم علی مذہب الجمہور فی جوانالہ جتہادہ صلی اللہ علیہ وسلم و لیس ہو عملہ بمعہد المناہم ہذا ملایشک فیہ بالہ خلاف لہ ابو داؤد و ترمذی، باب بدر الاذان لہ ترمذی و کتاب التفسیر سورہ انفال (حاشیہ صفحہ ۵۴) لہ ابو داؤد، کتاب الجہاد، صحیح بخاری کتاب النازی لہ و سہ یہ حدیث اثر کے طور پر باختلاف لفظ بروایت ابو ہریرہؓ ابن بخاری میں اور بروایت ابن عمرؓ رضی اللہ عنہما اور بروایت ابو بکر صدیقؓ (بقیہ صفحہ آئندہ)

خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عادل امام کو قیامت کے دن خدا کا سایہ نصیب ہوگا۔ جو لوگ سلطنت کے کاموں کو اخلاق اور نیکی کے ساتھ انجام دیں، ان کو اپنے اس حسن عمل کا ثواب اسی طرح ملے گا جس طرح دوسری عبادات کا، گویا حکومت کرنا بھی ایک عبادت ہے۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ سلطنت بھی عبادت ہو گئی اور ہر قسم کی بددیانتی، خیانت، فریب، سازش، توری و ظلم کا اسلامی سیاست سے خاتمہ ہو گیا، امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں رومیوں سے ایک مدت معینہ کے لیے صلح کر لی تھی، لیکن وہ اس مدت کے اندر اپنی فوج سرحد کے قریب لیے ہوئے اس تاک میں تھے کہ جیسے ہی مدت ختم ہو وہ رومیوں پر حملہ کر بیٹھیں، ایک نامی اور مشہور صحابی نے جو اس فوج میں شریک تھے فوراً ان کی اس ہمت عملی پر اعتراض کیا اور فرمایا کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بدعہدی قرار دیا ہے جس سے مسلمانوں کو باز رہنا چاہیے، یہ سن کر انہوں نے اپنی فوج ہٹا لی۔

ہر سلطنت کو ٹیکس، مال گزاری، اور خراج کے وصول کرنے کے لیے ہمیشہ سختی سے کام لینا پڑتا تھا، اور اگر حکام کی طرف سے ذرا سی سہل انگاری اور بے پروائی ظاہر ہو تو دفعۃً سلطنت کا خزانہ خالی ہو جاتا ہے مجرم جب کسی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا تو اس کو حکام کی غضب آلود نگاہوں میں جرم کی ایک شعاع بھی نظر نہ آئے گی، اور وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ہر قسم کے خدع و فریب، مکر و حیلہ اور دروغ بیانی سے کام لینا اپنا سب سے بڑا فرض خیال کر لے گا، اس میں شخصی و جمہوری حکومتوں میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ دونوں ہی قسم کی سلطنتوں میں یہ نتائج یکساں طور پر ظہور پذیر ہوں گے، یورپ آج ظاہری و ناماتی تمدن تہذیب میں بہت ترقی کر گیا ہے۔ تمام ملک میں تعلیم عام ہو گئی ہے، ہر فرد موز سیاست سے واقف ہو گیا ہے اور سلطنت پر جمہور کا حق مسلم ہو گیا ہے لیکن بائیں ہمہ اگر سلطنت ذرا بھی سہل انگاری سے کام لے تو ایک فرد بھی محاصل سلطنت کو بخوشی ادا کرنے پر آمادہ نہ ہوگا، مجرموں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ جرم کے ارتکاب کے بعد کبھی روپوش ہو جاتے ہیں، کبھی جرم کے پاداش سے بچنے کے لیے ہزاروں، لاکھوں خرچ کر دیتے ہیں، باوجودیکہ یورپ میں بہ نسبت اور گھگھوں کے مجرموں کی حالت نہایت بہتر ہے اور سسرال محض اخلاقی اصلاح

(بقیہ حاشیہ) ابن ابی ثیبہ میں ہے، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع نہیں، بظاہر ان حضرات صحابہ کے اقوال ہیں، تفصیل کے لیے دیکھئے المقاصد الحسنیٰ سنائی اور کشف الخفاء و مزیل الالتباس عطایا علی لفظ سلطان، یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قدیم عربی میں 'السلطان' کے معنی بادشاہ کے نہیں، بلکہ طاقت و قوت کے ہیں، جو انگریزی لفظ باور کے ہم معنی اور گورنمنٹ اور حکومت کے مراد ہے، اس لیے اس حدیث کے معنی یہ نہیں کہ بادشاہ زمین میں خدا کا سایہ ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ عمال حکومت پر بھی اس بے کر وہ حکومت کے نائب ہیں۔ سلطان کا اطلاق ہوتا ہے جیسے حدیث میں ہے: 'السلطان ولیّ المؤمن لا ولیّ لہ یعنی جس کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی سلطان ہے، یہاں سلطان سے مقصود سلطنت ہے اس لیے اس کا ہر جائز نمائندہ جیسے قاضی اور حاکم اور والی سلطان کہلائے گا، بادشاہ کے معنی میں یہ لفظ غالباً چوتھی صدی میں سلطان محمود کے زمانے سے بولا جانے لگا ہے (حاشیہ صفحہ ۵۷) لے صحیح بخاری، باب فضل من ترک الفواحش :

کے لیے دی جاتی ہے لیکن بائیں ہمہ کوئی یورپین اپنے جرائم کا صداقت سے اعتراف نہیں کرتا، بلکہ اس کی دروغ بیانی میں ندامت اور شرمندگی کی جگہ جرأت و دلیری کا عنصر غالب ہوتا ہے اور اس کو جمہوریت و حریت کی ایک برکت خیال کیا جاتا ہے لیکن جب کسی سلطنت کا نظام اخلاقی اصول پر قائم ہوتا ہے تو اس کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے، ہر فرد سلطنت کے تمام احکام کو مذہبی پابندیوں کی طرح موجب عذاب و ثواب سمجھتا ہے اس لیے ان پر باجبر و اکراہ عمل کرتا ہے اور یہ نتیجہ صرف اخلاق اور روحانیت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے اسلام کا نظام سلطنت اسی اخلاقی اصول پر قائم تھا اور اس کا ویسا ہی نتیجہ ظاہر بھی ہوتا تھا، صدقہ و زکوٰۃ عرب کے لیے ایک بالکل جدید چیز اور افلاس و غربت کی وجہ سے ان کا ادا کرنا ان کے لیے مشکل تھا، چنانچہ کعب بن اشرف کے قتل میں محمد بن مسلمہ نے اسلام کی جن مشکل باتوں کی بظاہر شکایت کی تھی ان میں ایک صدقہ و زکوٰۃ کی گراں باری بھی تھی، صدقہ اور زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لیے اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی میں عمال مقرر کر دیئے گئے تھے تاہم اس کا کوئی باقاعدہ و فرد و سرشتہ اور نظام قائم نہیں ہوا تھا، ایسی حالت میں اگر عرب میں کوئی دینیوی سلطنت جمہوری اصول پر بھی قائم کر دی جاتی تو اس کو صدقہ و زکوٰۃ کے وصول کرنے میں غیر معمولی دشواریاں پیش آتیں، لیکن یہ اسلام کے نظام سلطنت کا اخلاقی اثر تھا کہ ہر فرد اور ہر قبیلہ خود اپنا صدقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لاکر پیش کرتا تھا اور اس کے صلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت آمیز دعاؤں کی دولت لیکر واپس جاتا تھا، صحیح بخاری میں عبد اللہ بن ابی اوفی سے روایت ہے :-

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اتاہ قوم بصدقۃ قال اللہم صل علی ال فلان، فاتاہ ابی بصدقۃ فقال اللہم صل علی ال ابی اوفی (بخاری کتاب الزکوٰۃ ص: ۲۰۲)

حضرت عدی بن حاتم قبیلہ طے کے سردار تھے اور ان کو تمام قوم کی طرف سے مرابا یعنی جو تھا پاتا تھا۔ جو عرب میں اسلام سے پہلے سرداران قریش کا خاص حق خیال کیا جاتا تھا لیکن جب وہ اسلام لائے تو ان سے پہلے انہی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے قبیلے کا صدقہ پیش کیا، صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ایک بار وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا :

ان اول صدقۃ بیضت وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وجہ اصحاب صدقۃ طی جئت بہا (مسلم ج ۲ کتاب الفضائل)

پہلا صدقہ جس کی مسرت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا چہرہ چمکا، اٹھا، قبیلہ طے کا صدقہ تھا جس کو تم نے لے کر آئے تھے۔

قبیلہ بنو تمیم جب آپنا صدقہ لیکر آیا تو آپ نے فرمایا:

یہ ہماری قوم کا صدقہ ہے۔

صدقات قوم منالہ

اشخاص کی حالت اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کا حکم دیا تو ہم لوگ باز اردوں میں جا کر بوجھ ڈھوتے تھے اور اس سے جو مزدوری ملتی تھی اس کو لا کر صدقہ میں دیتے تھے۔

جرائم کی یہ صورت تھی کہ گودہ مٹ تو نہیں گئے تھے لیکن اس درجہ کم ہو گئے تھے کہ گویا نہ ہونے کے برابر تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جو لوگ اتفاق سے ان کے ترکب ہوتے تھے تو جرم کا نشہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی ان کے دل نور ایمان سے چمک اٹھتے تھے اور اس داغ کو دھونے کے لیے بیتاب ہو جاتے تھے، چنانچہ بعض صحابہ نے بارگاہ نبوت میں آکر جس صداقت کے ساتھ اپنے جرائم کا اعتراف کیا ہے اس کی مثال دنیا کی مذہبی تاریخ میں ڈھونڈنا بے سود ہے۔ اسلام میں جرائم کی سزائیں جو نہایت سخت مقرر کی گئی ہیں مثلاً جوری کے جرم میں ہاتھ کاٹے جاتے ہیں، زنا کی سزا میں کوڑے لگائے جاتے ہیں، یا سنگسار کیا جاتا ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور یہی حکمت لوگوں میں اعتراف جرم کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور مجرم خود حاضر ہوتے تھے اپنے جرموں کا از خود اعتراف کرتے تھے اور سزا جاری کرنے کی درخواست کرتے تھے۔

ماہر بن مالک ایک صاحب تھے، انہوں نے ایک لونڈی کے ساتھ زنا کیا، جب انہیں ہوش آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر از خود اس جرم کا اظہار کیا اور عرض کی: یا رسول اللہ مجھے پاک کیجئے (صحیح مسلم باب الرجم) یا رسول اللہ! مجھ پر حد جاری فرمائی جائے، آپ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا، انہوں نے دوبارہ کہا کہ میں نے زنا کیا ہے مجھ پر حد جاری فرمائیے، اسی طرح وہ بار بار اعتراف جرم کرتے تھے اور آپ اعراض فرماتے رہے، چوتھی بار آپ نے فرمایا کہ کیا تم اس کے ساتھ ہمبستر ہوئے؟ انہوں نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کے ساتھ مباشرت کی؟ انہوں نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا کیا تم نے اس کے ساتھ جماع کیا؟ انہوں نے کہا ہاں! ان تمام مراتب کے بعد آپ نے ان کے سنگسار کرنے کا حکم دیا جب ان پر پتھر برسے لگے تو انہوں نے بھاگنا شروع کیا۔ بالآخر ایک صحابی نے بڑھ کر اونٹ کے پاؤں کی ہڈی اٹھا کر ماری اور وہ وہیں ٹھنڈے ہو گئے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: ان کو چھوڑ کیوں نہ دیا۔ شاید وہ توبہ کرتے اور خدا کی توبہ کو قبول کر لیتا۔

اس واقعہ سے قانون سزائیں ایک نئی دفعہ کا اضافہ ہوا، اگر کوئی مجرم اپنے جرم کی خود ذاتی اعتراف کی بنا پر سزا پارہ ہو اور وہ آٹھ سزائیں بھاگ نکلتا چاہتا ہو تو اس کے فرار کو اقرار سے رجوع سمجھ کر اس کی باقی سزا معاف کر دی جائے گی اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہو جائے گا۔

۱۔ و تلہ صبح بخاری جلد اول کتاب الزکوٰۃ باب اتقوا النار و لو بشق تمرة و کتاب الحجۃ باب من اجز نفسه لہ ابو داؤد ج ۲ ص ۱۳۵ و صبح بخاری کتاب الحدود ۴

ایک اور نوجوان کا ذکر ہے جو شدید بیماری کی حالت میں اس گناہ میں مبتلا ہوئے اور کسی نے ان کو نہیں دیکھا لیکن انہوں نے از خود اپنے بیمار داروں سے اس کا اقرار کیا اور اسے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر میری طرف سے عریض کرو اور توبہ کی پوچھو، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا، حضور نے انکی شدت علالت کے سبب ایک معمولی سزائیں کی بلکہ کعب بن عمرو ایک اور صاحبک واقعہ ہے جنہوں نے آکر یہ اقرار کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک بیکار عورت سے دوسرے لطف اندوزی کی ہے، گو ہم بستر نہیں ہوا، تو یہ گنہگار موجود ہے اس پر اللہ کا حکم جاری فرمائیے۔

غزوہ حنین کے بعد ان اطراف میں اسلام کے اقتدار کا آغاز تھا کہ ایک مجلس نے جس کا نام محکمہ عقیدہ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر دیا، دونوں کے حامی اور طرفدار رئیس خدمت اقدس میں آئے اور فیصلہ چاہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عادت شریک کے مطابق خون کا معاوضہ داکر دینا چاہا، مگر ایک فریق کی طرف قصاص پر اصرار اور دوسرے کی طرف سے انکار اس جوش سے ہوا کہ دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں ایک نے اٹھ کر کہا کہ یا رسول اللہ! ابھی اسلام کے اقتدار کا آغاز ہے، ابھی ایسی نرمی نہ کی جائے کہ بھیڑ پہلے ہی بدک جائے، لیکن حضور نے ریت ہی پر زور دیا یہ دیکھ کر قاتل نے اگے بڑھ کر خوابنے کو پیش کیا کہ یا رسول اللہ! مجھ سے یہ گناہ ہوا ہے میری مغفرت کے لیے دعا فرمائیے۔

یہ واقعات ایک دینی سلطنت اور ایک اخلاقی سلطنت میں نمایاں حد فاصل قائم کر دیتے ہیں، دینی سلطنت میں مجرم اس لیے جرم سے انکار کرتے ہیں کہ انکو سزا سے نجات مل جائے گی، لیکن ماہر صنی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ نے اس بنا پر جرم کا اعتراف کیا کہ دنیاوی سزا کے اجر و ثواب سے وہ آخرت کے عذاب سے بچ جائیں گے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا و استغفار سے ان کے گناہ معاف ہو جائیں گے، دینی سلطنت میں حلال اس بنا پر سزا دیتا ہے کہ وہ اس خدمت پر مامور ہے، لیکن صحابہ نے ماہر پر اس لیے پتھر برسائے کہ انہوں نے حکم الہی کی بے محابا تنفیذ کی توفیق پائی، دینی سلطنت میں مجرم کا بھاگ نکلنے کی کوشش کرنا ایک دوسرا جرم ہے، لیکن اسلام کے نظام سلطنت میں وہ توبہ کا ذریعہ ہے۔

اخلاقی اور دینی سلطنتوں کے طرز عمل میں اس موقع پر نمایاں امتیاز قائم ہو جاتا ہے جہاں کوئی مجرم خود سلطنت کو مدد پہنچانے کے لیے کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے، ایک رجم دینی سلطنت خراج کو معاف کر سکتی ہے، بڑے بڑے جرائم درگزر کر سکتی ہے، رعایا کی ساتھ نہایت رفق و ملاطفت کا برتاؤ کر سکتی ہے لیکن وہ کسی بدخواہ سلطنت کے معمولی سے معمولی جرم سے اغماض نہیں برت سکتی، عہد نبوت میں بعض مسلمانوں نے بعض ایسے کام کیے جن بظاہر جنگی و سیاسی امور کو نقصان پہنچ سکتا تھا، مگر چونکہ انکی نیت صاف تھی اور ان کے دل پاک تھے، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس جرم سے صرف اس بنا پر چشم پوشی فرمائی کہ انہوں نے اس سے پہلے اسلام کی ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی تھی جس کے انکے ایمان کی پسمانی پوری ظاہر ہو چکی تھی، حاطب ابن بلتعہ ایک صحابی تھے، انہوں نے کفار قریش کے پاس ایک خط لکھا جس میں ان کو مسلمانوں کے مخفی حالات کی خبر دی تھی، یہ خط پکڑا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ اس نے خدا، خدا کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی، اجازت

لہ ابو داؤد باب فی اقامۃ الحد علی المرتبین لہ ایضاً باب یصل لرجل و دون الجماع و صحیح بخاری جلد اول کتاب الدیات ۴

دیکھئے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ حاطب نے کہا خدا کی قسم میرے ایمان میں کوئی خلل نہیں آیا ہے، خط لکھنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ مکہ میں اپنی آل و اولاد کو چھوڑ کر جو مہاجرین چلے آئے ہیں، ان کا خاندان وہاں موجود ہے اور وہ ان کی حفاظت کرتے ہیں، لیکن میرے بال بچوں کو وہاں کوئی سہارا نہ تھا، اسی لیے میں نے چاہا کہ کفار پر ایک احسان کروں جس کے بدلے میں میرے بال بچوں کی حفاظت ہو جائے، آپ نے فرمایا: سچ کہتے ہیں، ان کی نسبت ضرر چھ کلمات استعمال کر رہے ہو، گمانی کوراء نزد، لیکن حضرت عمرؓ نے پھر کہا کہ اس نے خدا، خدا کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، جہازت دیجئے کہ اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آپ نے فرمایا، کیا وہ اہل بدر سے نہیں ہیں، کوئی بات ہے جس کی بنا پر خدا نے اہل بدر کے متعلق یہ فرمایا ہے:

اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ وَجَّهْتُ لَكُمْ الْبَحْتَ
جو چاہو کرو، کیونکہ جنت تمہاری قسمت میں لکھی جا چکی ہے۔
یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھیں ڈھل باگیں اور کہا کہ خدا کے رسول کو سب زیادہ علم ہے۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب بن بلتعہ کے معاملہ میں جو طرز عمل اختیار فرمایا وہ شرکت بدر کی فضیلت پر مبنی تو تھا ہی اس کے ساتھ ایک ایسے اصول پر بھی مبنی تھا جسکو دینوی اور اخلاقی سلطنتوں کے درمیان ایک حد فاصل قرار دیا جاسکتا ہے، سیاست کا ایک لازمی جز بدگمانی ہے، اور اسی بنا پر وہ بادشاہ سب سے زیادہ مدبر اور دور اندیش خیال کیا جاتا ہے جو سلطنت کے راز کو اپنے عزیز و اقارب تک سے چھپائے، لیکن یہ اصول صرف دینوی سلطنتوں کا ہے اور اسی وجہ سے ان سلطنتوں میں حاکم و محکوم میں اتحاد اور خلوص نہیں پیدا ہوتا، لیکن اخلاقی اور مذہبی سلطنتوں میں تمام تردد اور مدار اخلاص باللہ، باہمی خلوص اور اعتماد پر ہے اور اسی خلوص اعتماد کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاتم بن بلتعہ کے جرم سے چشم پوشی کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کو ان مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

حسن الظن من حسن العبادة (ابوداؤد کتاب الادب ص ۱۹۸) حسن ظن ایک قسم کی عبادت ہے۔
قرآن مجید نے اس کو اور واضح کر دیا ہے:

إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِتْمٌ
بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاسی اصول کے طور پر اس کی تعلیم دی ہے۔

إِنَّ الْمِيرَ إِذَا ابْتغَى الرِّبَةَ فِي
النَّاسِ أَفْسَدَهُمْ
جو امیر لوگوں کے ساتھ بدگمانی کی جستجو کرے گا وہ ان کو برباد کر دے گا۔

اور عمال سلطنت کو اس اصول پر عمل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے:

عن معاوية قال سمعت رسول الله صلى الله عليه
وسله يقول أفك ان اتبع عورات الناس
حضرت معاویہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم لوگوں کے جرائم کی ٹوہ میں رہے تو تم نے یا تو انکو

لہ بخاری ج ۲ کتاب المغازی ص ۵۶۰

افسد قلوبهم وكدت ان تفسدهم
برباد کر دیا ہے یا عنقریب برباد کر دوں گے۔
چنانچہ جب تک حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور قائم رہا، تمام معاملات میں اسی اصول پر عمل ہوا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے سامنے ایک شرابی پیش کیا گیا اور اس کی نسبت کہا گیا کہ اس کی داڑھی سے شراب ٹپکتی ہے لیکن چونکہ انہوں نے خود اس کو شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس لیے فرمایا کہ ہم کو ٹوہ لگانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ البتہ جو جرم علانیہ ہوتا ہے اس پر ہم مواخذہ کرتے ہیں۔

دخین حضرت عقبہ بن عامر صحابی کے منشی تھے، انہوں نے ان سے شکایت کی کہ ہمارے ہمسائے شراب پیتے ہیں، میں نے ان کو منع کیا، وہ لوگ باز نہیں آئے، اب ان کے لیے پولیس کو بلاتا ہوں، حضرت عقبہ نے فرمایا کہ درگزر کرو، دخین نے دوبارہ کہا کہ اب وہ لوگ ترک شراب سے انکار کرتے ہیں، میں پولیس کو بلاتا ہوں حضرت عقبہ نے پھر فرمایا کہ درگزر کرو، کیونکہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ

من دای عودہ فستوها کان کمین احیی موع وودہ۔ جس نے کسی برائی کو دیکھ کر چھپایا اس کا درجہ اس شخص کے برابر ہے جس نے ان برائیوں کو موت سے بچالیا جو زندہ درگور کر دی جاتی ہیں۔

اخلاقی حیثیت سے اس اصول کی خوبی میں کسی شخص کو کلام نہیں ہو سکتا، لیکن ہم کو صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ سیاسی حیثیت سے سلطنت پر اس اصول کا کیا اثر پڑ سکتا ہے ابن خلدون نے اس پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ تلوار کی دھار کا تیز کرنا سلطنت کے لیے مفید ہے اور اس کو اکثر برباد کر دیتا ہے، اس مضمون میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ تمام تر سیاسی اصول کی شرح ہے جس کا اشارہ قول نبوی میں ملتا ہے، اس لیے ہم اس موقع پر اس اصول کی سیاسی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیے اس مضمون کا خلاصہ نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

”جاننا چاہیے کہ رعایا کی مصلحت کا تعلق سلطانی ذات جسم، حسن، ذیل، دول، وسعت، علم، حسن خط اور ذہانت کے ساتھ نہیں ہوتا، ان کی مصلحت کا تعلق سلطان کی ذات کیساتھ ہوتا ہے، اس لیے ملک اور سلطنت ایک اضافی چیز ہے، اور دو شخصوں کے درمیان ایک قسم کا تعلق ہے، سلطان کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ رعایا کا سرکار اور ان کا سربراہ اور نگران ہے، اس لیے سلطان وہ ہے جس کے پاس رعایا ہو اور رعایا وہ ہے جس کا کوئی سلطان ہے اور اس نسبت سے جو صفت مستنبط ہوتی ہے اسی کا نام بادشاہی ہے، پس جب یہ صفت اور اس کے لوازم ٹھیک ہوتے ہیں تو سلطان کا مقصد کامل طور پر حاصل ہوتا ہے اگر وہ عمدہ ہے تو وہی رعایا کی عین مصلحت ہے، اور اگر وہ بری اور ظالما ہے تو وہ ان کیلئے مضرب اور ایسی ہلاکت کا سبب ہے سلطان کی خوبیوں کا تمام تردد اور مدار نرمی پر ہے، کیونکہ سلطان اگر ظالم ہو، سخت گیر ہو، لوگوں کے معائب کی کرید کرے، ان کے جرائم کو ایک ایک کر کے گنے تو رعایا پر خوف و ذلت طاری ہو جاتی ہے، اور لوگ ان سے بچنے کے لیے جھوٹ اور دکر فریب کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہی چیزیں ان کا اخلاق بن جاتی ہیں اور پھر ان کا ضمیر اور نظام اخلاق برباد ہو جاتا ہے، وہ جنگ کے موقعوں پر اس سے پہلو تھمتے ہیں، اور بسا اوقات ان کے قتل پر بھی آمادہ

نہ یہ تمام حدیثیں ابو داؤد کتاب الادب ص ۱۹۰ باب فی النبی عن ابیہم میں ہیں:

ہو جاتے ہیں اور اس سے خود سلطنت برپا ہو جاتی ہے، اور اگر اس قسم کے ظالم سلاطین کی حکومت قائم رہ جائے تو جذبہ محبت بالکل مٹ جاتا ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا لیکن اگر سلطان رعایا کے ساتھ نرمی کرے، ان کے گناہوں سے درگزر کرے تو وہ اس کے پہلو میں سو جاتے ہیں اور اس کے دشمنوں کے مقابل میں جان دے دیتے ہیں، پھر پہلو سے سلطنت کا نظام ٹھیک ہو جاتا ہے، سلطنت کی خوبیوں کی اصل حقیقت یہی ہے، لیکن اس کے لوازم و لواہج میں چند چیزیں اور بھی ہیں مثلاً ان پر احسان کرنا اور ان کی معاش کا خیال رکھنا کہ یہ بھی ایک قسم کی نرمی ہے اور رعایا کی محبت حاصل کرنے کا سب سے بڑا اصول یہ ہے، جانا چاہیے کہ یہ لوگ بیدار مغز اور تیز فہم ہوتے ہیں انہیں نرمی بہت کم پائی جاتی ہے، نرمی اکثر سیدھے سادھے اور بھولے بھالے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ بیدار مغز لوگوں کی نگاہ چونکہ دور رس ہوتی ہے اور وہ ابتداء ہی سے انجام کار کو پیش نظر رکھتے ہیں، اس لیے لوگوں کو تکلیف مالا یطاق دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ تباہ ہو جاتے ہیں، اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کمزور لوگوں کی روش اختیار کرو، اور حاکم کیلئے یہ شرط قرار دی ہے کہ وہ بہت چالاک نہ ہو چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب زیاد بن سفیان کو معزول کیا تو انہوں نے کہا: کیا میں اس منصب کے فرائض کو انجام نہیں دے سکتا؟ یا میں نے کوئی خیانت کی ہے؟ حضرت عمر نے جواب دیا کہ یہ کچھ نہیں، میں نے تم کو صرف اسی بنا پر معزول کیا ہے کہ میں رعایا پر تمہارے عقل کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔

ابن خلدون نے ان خطروں میں جو آئین جہاں بانی پیش کیا ہے، اس پر اگرچہ دینی سلطنتوں میں بھی عمل کیا جاسکتا ہے، لیکن اس طرز عمل کا جو دوسرا پہلو ہے یعنی یہ کہ اس نرمی کے برتاؤ سے رعایا میں خیرہ سری، جرائم سے بے پرواہی اور احکام سلطنت کے عدم تعمیل کا خیال نہ پیدا ہو جائے اور ضعیف حکمرانوں کی نرمی سے یہ باتیں سلطنتوں میں پیدا ہوتی ہیں، مگر اسلام نے جس تخیل پر سلطنت کی بنیاد رکھی ہے، وہ سراسر اندہی ہے، اس کے احکام کی اطاعت خدا کی خوشنودی کا باعث اور اس کا انکار آخرت کا گناہ بتایا گیا ہے۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو قانون شریعت کے اس پہلو یعنی نرمی سے کام لیا جائے، جس سے لوگوں میں امن و اطمینان پیدا ہو، جرائم کی تحقیق میں شہادت کا اصول اپنایا ہو عدل میں صداقت کی خلاف ورزی نہ ہو، امیر مغرب اور اوپنچے اور نیچے قانون کی نظر میں برابر ہو، مجرموں کو اس وقت تک سزا نہ دی جائے جب تک شہادت اپنے پورے شرائط کے ساتھ ثابت نہ ہو جائے، اثبات جرم میں شکوک و شبہات کے موقع پر مجرم سے حدود کو ساقط کیا جائے اور قساوت اور سنگدلی کی ان تمام سزاؤں کو جو ظالم و جاہل بادشاہوں نے جاری کر رکھی تھیں، ان کو یک قلم منسوخ کر دیا جائے، چنانچہ فرمایا:

ان اللہ يعذب الذين يعذبون في الدنيا۔ بے شہہ خدا ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔

صحابہ کے آخر دور میں جب خلافت نے سلطنت کی صورت اختیار کر لی اور ظلم و ستم کی ہنگامہ آرائیاں شروع ہوئیں تو جن بزرگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض صحبت اٹھایا تھا، انہوں نے اسی حدیث کے ذریعہ سے عمال کی دست درازیوں کو روکنا چاہا۔ ایک بار حضرت ہشام بن حکیم بن حزام کا گذر شام میں ہوا تو دیکھا کہ چند بنی دھوپ میں کھڑے کیے گئے تھے، انہوں نے اس کی وجہ پوچھی، لوگوں نے کہا کہ جزیہ کے بارے میں ان کو یہ سزا دی گئی ہے۔

انہوں نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ خدا ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔

دنیوی حکمران لطف و محبت کا برتاؤ زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے ساتھ کر سکتے ہیں، غیر قوموں کے ساتھ
مہذب سے مہذب سلطنت کا برتاؤ بھی کچھ نہ کچھ ظالمانہ ہوتا ہے، لیکن ہشام بن حکیم بن حزام نے اس حدیث
کو اس موقع پر بیان کیا جب کہ غیر قوموں کے آدمیوں پر ظلم کیا جا رہا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا نظام
سلطنت کسی غاصبی اثر سے اس اصول پر قائم نہیں ہوا تھا، بلکہ لطف و محبت اس کا خیرہ تھا، اور اس لیے یہ ایک ہم
قوم کے سر پر سایہ افکن تھا، معاملات حکومت میں خود آپ کا طرزِ عمل اس قدر فیاضانہ اور آسان تھا کہ لوگ آپ
کی خدمت میں جرائم کا اعتراف اس بنا پر کرتے تھے کہ آپ اس میں کوئی تخفیف یا آسانی پیدا کر دیں گے، مسلمان
تو مسلمان غیر قوموں کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیاضانہ طرزِ عمل کا اعتراف تھا، چنانچہ یہودیوں
میں دو مرد و دو عورت نے زنا کیا تو تمام یہودیوں نے بالاتفاق کہا کہ ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت
میں انکو لے چلنا چاہیے کیونکہ وہی ایک ایسے پیغمبر ہیں جو تخفیف کو لیکر مجبور ہوئے ہیں، یعنی سزا میں نرمی برت سکتے ہیں۔
ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں سزا کا مستحق ہوں، مجھ پر حد جاری فرمائیے، آپ نے پوچھا
کیا وضو کر کے چلے تھے؟ اُس نے کہا مل، آپ نے دریافت فرمایا کیا ہمارے ساتھ نماز پڑھی تھی؟ اس نے
کہا مل، آپ نے فرمایا: جاؤ خدا نے معاف کر دیا۔

لوگوں کے حوائج اور ضروریات کا اس قدر خیال فرماتے تھے کہ ایک لونڈی بھی جہاں چاہتی آپ کو اپنے کام کے لیے لہتہ پکڑ کر لیا کرتی، ایک مجنوں کو اس عورت آئی اور کہا کہ مجھے آپ سے ایک ضرورت ہے، آپ مجھے فرمایا تو اس نے کام کیلئے مدینہ کی جس گلی میں لے چلو میں چلنے کو تیار ہوں، چنانچہ آپ اس کے ساتھ گئے اور اس کے کام کو انجام دینے یا عدنی بن حاتم جو مدینہ نصرانی اور طے کے رئیس تھے اور رومی درباروں میں چکے تھے جب وہ حاضر خدمت ہوئے تو انکو شک تھا کہ آیا حضور بادشاہ ہیں یا نبی ہیں، لیکن جب انکی نگاہ کے سامنے سے یہ منظر گذرا تو کہہ اٹھے کہ حضور بادشاہ نہیں کیونکہ یہ حسن خلق تو نبی ہی میں پایا جاسکتا ہے اور اس کے بعد فوراً آپ کی نبوت پر ایمان لے آئے۔ متعدد واقعات اوپر ایسے گذر چکے ہیں کہ دیہات کے اعرابی آپ کی خدمت اقدس میں آتے تھے اور نہایت بے تکلفی بلکہ بے باکی کے ساتھ سوال و جواب کرتے تھے، اور حضور ان کے ساتھ رفیق و ملاطفت کا برتاؤ کرتے تھے، ایک بدو نے ایک دفعہ آپ کی چادر پکڑ کر کھینچی تو آپ اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے اور اس کو عطیہ دیا، بعض لوگوں سے اس قسم کے گناہ ہو جاتے تھے جن کے لیے ان کو مالی کفارہ ادا کرنا ضروری ہوتا تھا، لیکن ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو اپنے افلاس اور تنگدستی کے سبب خود کو مالی کفارہ ادا نہیں کر سکتے تھے، تو

۱۔ مسلم ج ۲، ص ۳۹، کتاب الادب ۷ ابوداؤد ج ۲ ص ۳۹ کتاب المحدثات ابوداؤد ج ۲ ص ۳۲ کتاب المحدثات
 ۲۔ جو قصور ان سے ہوا اتھادہ حد کے قابل نہیں تھا اس لیے حکم ان المحسات بذہین السیئات اس تصور کی معافی کی خوشخبری

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت المال سے ادا فرمادیتے تھے، ایک صحابی نے اس ڈر سے کہ روزوں میں ان سے کوئی بے عزتی نہ ہو جائے، اس سے بچنے کی تدبیر کی کہ انہوں نے اپنی بیوی سے رمضان میں ظہار کر لیا، لیکن آخر ایک رات کو بے قابو ہو کر بیوی سے مباشرت کر لی، صبح کو گھبرا کر انہوں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے چلو، سب نے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو خود تنہا آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر حرم کا اعتراف کیا، آپ نے دوبار فرمایا: کیا تم نے ایسا کیا؟ انہوں نے دونوں دفعہ جواب میں عرض کی ہاں! ہاں! یا رسول اللہ مجھ ہی سے یہ حرکت ہوئی اور اب خدا کا جو حکم ہو اس کو صبر کے ساتھ انگیز کر کے کوتاہی ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو کہا ہے آپ حکم فرمائیں، فرمایا: ایک غلام آزاد کرو، انہوں نے اپنی گردن پر لہتہ مار کر کہا کہ یا رسول اللہ اس گردن کے سوا تو میرے قبضہ میں کوئی غلام نہیں، آپ نے فرمایا کہ مستقل دو مہینے کے روزے رکھو، عرض کی یا رسول اللہ جو پیش آیا وہ تو روزے ہی کا نتیجہ ہے، آپ نے فرمایا تو پھر ساتھ مسکینوں کو ایک وسیع کھجور دو، عرض کی یا رسول اللہ! ہم نے تو خود رات فاقہ سے بسر کی ہے، آپ نے ان کی یہ بات سن کر ارشاد فرمایا کہ صدقہ بنو زریق کے عامل کے پاس جاؤ، وہ تم کو اس قدر کھجوریں دیدے گا اس میں ساتھ فقیروں کو بھی کھلاؤ اور جو بیچ رہے وہ اپنے بال بچوں کو کھلاؤ، وہ پلٹے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے تمہارے یہاں تنگی و ہتہمیری اور رسول اللہ کے یہاں وسعت اور مشورہ نیک پایا۔

مسلمانوں کی طرف سے اخلاص و عقیدت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شفقت اور لطف و کرم کے اس دو گونہ جذبے نے رعایا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قدر شیفتگی پیدا کر دی تھی جس کی بھٹک سلاطین و بیوی کے تاجمانے مرصع اور ان کے لباسائے فاخرہ میں نظر نہیں آسکتی، عرب کے بدوؤں کی مطلق العنانی، خود سری اور سرکشی کی جو داستانیں عام طور پر بیان کی جاتی ہیں اور جن کی بنا پر خیال کیا جاتا ہے کہ انکی وجہ سے نہ عرب میں کوئی نظام سلطنت کبھی قائم ہوا ہے اور نہ ہو سکتا تھا، لیکن جب اسلام کا نظام سلطنت قائم ہوا اور اسلامی احکام نافذ کیے گئے تو ان ہی خود سر، سرکش اور مطلق العنان بدوؤں نے ان احکام کو سادگی اور جوش عقیدت کے ساتھ قبول کر لیا، اس کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے جو عہد نبوت میں پیش آئے، ایک دفعہ ایک بدو نجد سے چل کر مدینہ آیا، سفر سے پریشان، بال الجبے ہوئے اور اسی حالت میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور شریعت کے احکام پوچھے، فرمایا: دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں، عرض کی: کچھ اور نمازیں بھی؟ فرمایا نہیں، لیکن یہ کہ نفل پڑھو، پھر فرمایا: اور رمضان کے روزے، سوال کیا کہ کچھ اور روزے بھی؟ فرمایا نہیں، نہ یہ کہ نفل رکھو، پھر زکوٰۃ کو ذکر فرمایا، اس نے پھر پوچھا کہ اس کے سوا بھی کچھ صدقہ؟ فرمایا نہیں، مگر یہ کہ خود اپنی مرنی سے دو، اتنا سوال و جواب کر کے یہ کہتا ہوا چلا کہ خدا کی قسم میں ان میں کمی بیشی نہ کروں گا، یہ سن کر حضور نے فرمایا یہ شخص کامیاب ہو گیا ہو گیا اگر سچا نکلا (بخاری، کتاب الایمان)

ظہار کے معنی یہ ہیں کہ بیوی کو محرمات شریعت سے تشبیہ دیدی جائے، جیسے کوئی یہ کہے آج سے تو میری ماں برابر ہے اس صورت میں کفارہ لازم آتا ہے لہذا اس زمانہ میں رمضان میں رات کو مباشرت فی اجازت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔

ایک اور واقعہ ہے کہ صحابہ مجلس میں حاضر تھے کہ ایک بدو نے آکر کہا: آپ کا قاصد ہمارے پاس آیا اور اس نے ہم سے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ آپ خدا کے رسول ہیں اور آپ کو خدا نے بھیجا ہے، ارشاد ہوا: اس نے سچ کہا، اس نے کہا: آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے، اس نے کہا زمین اور پہاڑ کس نے بنائے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے، اس نے پھر کہا ان میں ہمارے فائدے کی چیزیں کس نے بنائی ہیں؟ فرمایا: اللہ عزوجل نے، اس نے کہا: اس خدا کی قسم جس نے آسمان کو پیدا کیا اور زمین کو بنایا، اور پہاڑ کو کھڑا کیا، اور ان میں فائدے رکھے، کیا سچ اللہ ہی نے آپ کو بھیجا ہے؟ فرمایا ہاں، اس نے پھر عرض کی کہ آپ کے قاصد کا بیان تھا کہ ہم پر پانچ وقتوں کی نمازیں ہیں اور ہمارے مال میں زکوٰۃ ہے؟ فرمایا: اس نے سچ کہا، کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو بھیجا، کیا خدا نے آپ کو یہ حکم دیا ہے؟ فرمایا: بیشک! پھر کہا: آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ سال میں ایک مہینہ کاروزہ بھی ہے؟ فرمایا: ہاں! سچ کہا، اس نے کہا قسم ہے اس کی جس نے آپ کو رسول بنایا، کیا خدا نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا: ہاں! پھر کہا: آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ قدرت ہو تو خانہ کعبہ کا حج کریں، فرمایا: ہاں! سچ کہا، عرض کی: اس کی قسم جس نے آپ کو بھیجا، کیا خدا نے اس کا حکم دیا؟ فرمایا: ہاں! اس نے عرض کی کہ قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں ان احکام کی تعمیل میں کچھ گھٹا بڑھانہیں کروں گا، ارشاد ہوا اگر یہ سچ کہتا ہے تو جنت میں داخل ہو گا (بخاری)

ایک اور مجلس میں صحابہ حاضر خدمت تھے اور حضور ﷺ لگائے تشریف فرما تھے اتنے میں ایک شتر سوار آیا اور سوار ہی مسجد میں داخل ہوا، پھر اونٹ سے اُترا اور مسجد ہی میں اونٹ کو باندھ دیا، پھر مجمع کے پاس آکر پوچھنے لگا، تم میں محمد کون ہیں؟ لوگوں سے کہا کہ وہ گورے آدمی جو ٹیک لگائے ہیں، اس نے کہا کہ اے عبدالمطلب کے بیٹے! حضور نے فرمایا: ہاں! کہو! اس نے کہا کہ میں تم سے کچھ پوچھوں تھا اور سختی سے پوچھوں گا تو تم رنجیدہ نہ ہونا، فرمایا جو چاہو پوچھو، اس نے کہا میں تمہارے پروردگار اور تم سے پہلوں کے پروردگار کا واسطہ دیکر پوچھتا ہوں کہ کیا تم کو اللہ نے سب لوگوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے؟ فرمایا: خدا یا ہاں! پھر فرمایا خدا کی قسم دیکر پوچھتا ہوں کہ کیا خدا ہی نے آپ کو حکم دیا ہے کہ پانچ وقتوں کی نماز پڑھیں؟ فرمایا: خدا یا ہاں! پھر کہا خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے کہا ہے کہ سال میں ایک مہینہ کاروزہ رکھیں؟ فرمایا: خدا یا ہاں! پھر کہا خدا ہی کی قسم دیکر پوچھتا ہوں کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے دو لہندوں سے زکوٰۃ لیں اور ہمارے محتاجوں کو بانٹ دیں؟ فرمایا: خدا یا ہاں! اس نے کہا میں ایمان لاتا ہوں اس پر جس کو لیکر آپ آئے ہیں، اپنے پیچھے والوں کا نائب ہو کر آیا ہوں میں صنام بن ثعلبہ ہوں (بخاری، کتاب الایمان)

ذرا اس سادگی، بے تکلفی اور یقین کی دولت کی اس فراوانی کا منظر دیکھئے اور شیفتگی و جہان نشادی کا ایک اور واقعہ سنئے۔

نیرایہ واقعات تو ان بدوؤں کے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آئے، صحابہ کرام

جن کا شرف یہ تھا کہ وہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جاشار تھے، وہ بھی اگر ان بدوؤں کی طرف سے گزرے تو ان کے ساتھ بھی انہوں نے اسی محبت کا ثبوت دیا، براد بن عازبؓ ایک مجاہدی تھے ان کا اونٹ ایک دفعہ کھو گیا تھا، وہ اس کو ڈھونڈنے نکلے تو بدوؤں میں پہنچ گئے، بدوؤں کو جب معلوم ہوا کہ یہ کون ہیں تو حضور کے تعلق سے وہ ان پر گھوم گھوم کر تار ہونے لگے (ابوداؤد، کتاب الحدود، ۲۱ ص ۱۳۹)

رعایا کی وفاداری، خلوص، جوش عقیدت کا سب سے بڑا امتحان گاہ میدان جنگ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا بڑا حصہ میدان جہاد ہی میں بسر ہوا ہے، صحابہ نے جس جوش کے ساتھ آپ کی حفاظت کی ہے اور جس خلوص کے ساتھ آپ پر جانیں نثار کی ہیں اس کی نظیر روم و ایران کی تاریخ میں نہیں مل سکتی، چنانچہ صلح حدیبیہ کے متعلق جب کفار قریش کے نمائندہ عروہ بن مسعود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو شروع کی تو ایک مجاہدی مغیرہ بن شعبہؓ آپ کی پشت پر مسلح کھڑے ہوئے تھے، عروہ گفتگو کرتے تھے تو مغرب کے طریقہ کے موافق آپ کی دائیں پکڑ لیتے تھے، لیکن جب جب ان کا ہاتھ آپ کی ریش مبارک کی طرف بڑھتا تھا، مغیرہ تلوار کے قبضے سے اس پر ٹھوکر مار کر کہتے کہ آپ کی ریش مبارک سے ہاتھ کو الگ رکھو، عروہ نے اس جوش عقیدت سے متاثر ہو کر دوسرے صحابہ کی طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ آپ کا لعاب دہن بھی گرتا تھا تو لوگ تبرکاً اس کو ہاتھ میں لیکر اپنے جسم اور چہرے پر لیتے ہیں۔ جب آپ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لیے سبقت کرتا ہے، جب آپ وضو کرتے ہیں تو لوگ وضو کے پانی کو تبرکاً لینے کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں جب آپ گفتگو فرماتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے، لوگ ادب اور تعظیم سے آپ کی طرف نگاہ جاکر نہیں دیکھ سکتے، وہ اس منظر جاہ و جلال کو دیکھ کر پلٹے تو اپنی قوم سے کہا کہ میں اکثر بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہو چکا ہوں، میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے دربار میں بھی گیا ہوں، لیکن میں نے کسی بادشاہ کے یہاں نہیں دیکھا کہ اس کے اصحاب اس کی اس قدر عزت کرتے ہیں جس قدر محمدؐ کے اصحاب محمدؐ کی تعظیم کرتے ہیں، جب وہ تھوکتے ہیں تو لوگ اس کو ہاتھ میں لیکر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے ہیں، جب آپ ان کو کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لیے پیش دہتی کرتا ہے۔ جب آپ وضو کرتے ہیں تو ہر شخص وضو کے پانی کے لیے لڑتا ہے۔ جب آپ کلام کرتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے، لوگ تعظیماً آپ کی طرف نگاہ جاکر دیکھ نہیں سکتے۔

غزوہ بدر کے متعلق جب آپؐ نے انصار سے مشورہ کیا تو اس موقع پر حضرت سعد بن عبادہ کی زبان سے جو فقرے نکلے وہ جوش، خلوص، عقیدت، محبت اور وفاداری کے جذبات سے لبریز تھے، انہوں نے کہا:

ایانا نرید یا رسول اللہ والذی نفسی
بیدہ لوامرتانا نخیضها البحر
لا خضناہا ولوامرتانا نضرب
یا رسول اللہ! کیا آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے، اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر آپ کا حکم ہو کہ ہم اس سمندر میں اپنے گھوڑے ڈالیں تو ہم ڈالیں گے

ابن بخاری ج ۱ ص ۲، کتاب الشروط ج ۱

اعبادہا الیٰ برکۃ الغنم اور اگر حکم ہو کہ ہم اپنی سواریوں سے برک الغنم لے لیں تو ہم کتاب الجہاد باب غزوہ بدر پر دھاوا کریں تو ہم کر دیں گے۔

غزوہ احد میں جب آپؐ نے کفار کی جمعیت کو ذرا گمراہ کر دیا تو حضرت ابو طلحہؓ نے جن الفاظ کے ذریعہ سے آپؐ کو روکا، اس سے زیادہ جوش محبت کی تفسیر کیا ہو سکتی ہے، انہوں نے کہا: بابی انت وامی لا تشرف یصیبک سحر من میرے باپ ماں آپ پر قربان، آپ گمراہ کر دیکھئے سہام القوم نحری دون نحرك (بخاری) کہیں آپ کو کوئی تیرنگ لگ جائے، میرا سینہ آپ کے سینہ کتاب المغازی، غزوہ احد کے سانے ہے۔

خیر یہ تو صحابہ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کے واقعات تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ یعنی صحابہ غیر قوموں میں گئے تو انکی محبوبیت کا یہی عالم تھا۔ چنانچہ غیر قوموں کو عمال بنوی کی سادگی اور انصاف پسندی کا منظر نظر آتا تھا، تو وہ بھی ان کی گرویدہ ہو جاتی تھیں، فتح خیبر کے بعد وہاں کی پیداوار کی تقسیم کے لیے آپؐ نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو مقرر فرمایا، وہ وہاں گئے اور تخمینہ کر کے ہر کھجور کے درخت سے ایک خاص مقدار وصول کرنا چاہی، اس پر یہودیوں نے کہا یہ تو بہت ہے۔ انہوں نے کہا اچھا! میں تخمینہ کر دیتا ہوں، تم لوگ اس کا نصف لے لینا، اس انصاف پسندی سے یہودی اس قدر متاثر ہوئے کہ سب کے سب یک زبان ہو کر پکار اُٹھے:

ہذا الحق بہ تقوم السماء والارض
قد رضینا ان تأخذہ بالذی قلت لہ

فتوح البلدان بلاذری میں ہے کہ یہودیوں نے ان کو رشوت دینا چاہی، لیکن انہوں نے کہا: اسے دشمنان خدا تم مجھ کو حرام کھلانا چاہتے ہو، خدا کی قسم میں ایک ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں، جو محبوب ترین خلایق ہے اور تم کو میں بندروں اور سوروں سے بھی زیادہ مبغوض رکھتا ہوں لیکن تمہاری دشمنی مجھ کو عدل و انصاف کی راہ سے نہیں ہٹا سکتی، یہ سن کر تمام یہودیوں نے کہا کہ آسمان و زمین اسی انصاف سے قائم ہیں بلکہ

لہ یمن کی سمت میں ایک مقام کا نام ہے ابوداؤد ج ۲ ص ۵، کتاب البیوع فتح البلدان بلاذری بطور عربی ص ۳۱

سلطنت اور دین کا تعلق

دنیا میں اس وقت دو قسم کی سلطنتیں ہیں، ایک وہ جس میں سلطنت کو مذہب سے قطعاً علیحدہ رکھا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دے اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دے، اس تعلیم میں قیصر اور خدا دو متقابل ہستیاں فرض کی گئی ہیں، جن میں سے ایک کا حکم دوسرے سے بالکل الگ ہے، اسی پر یورپ کی موجودہ سلطنتیں قائم ہوئی ہیں اور اسی کی بنا پر دین و دنیا کی دو علیحدہ حدیں بنائی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سلطنتیں خدا پرستی، دین داری، صداقت اور اخلاص نیت کے ہر منظر سے عاری اور غالی ہو کر رہ گئی ہیں۔ دوسری قسم کی سلطنت وہ ہے جس میں مذہب کو اس سے الگ نہیں رکھا گیا ہے، لیکن مذہب کی لطیف و نازک روح کو سلطنتی قوانین و آئین و ضوابط کی رسیوں میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ مذہب کی لطافت جاتی رہی اور رسوم و قوانین کی خشکی نے اس کی جگہ لے لی، یہودیت اور برہمنیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

اصل دین الہی ایک ہی ہے، ایک ہی رہا ہے، اور ازل سے ابد تک ایک ہی رہے گا اور وہ اسلام ہے۔ اِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (خدا کے نزدیک دین اسلام ہے) اس دین کی جامعیت کی تشریح مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے اور کی جاسکتی ہے، مانی میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ سلطنت اور دین کا معتدل مجموعہ ہے، وہ ایسی سلطنت ہے جو بہترین دین ہے یا ایسا دین ہے جو ستر پاپا سلطنت ہے مگر سلطنت الہی، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس سلطنت الہی میں قیصر کا وجود نہیں، اس میں ایک ہی اعلیٰ حاکم و آمر مانا گیا ہے و حاکم علی الاطلاق اور شہنشاہ قادر مطلق اللہ تعالیٰ ہے جل شانہ و تعالیٰ اسماء بادشاہی اسی کی ہے حکم اسی کا ہے فرمان صرف اسی کا صادر ہوتا ہے دوسرے مجازی حاکموں اور آمروں کا حکم اسی وقت مانا جاتا ہے جب وہ عین حکم الہی ہو، یا اس کا مبنی ہو اور کم از کم یہ کہ اس کے مخالف نہ ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دین کے سب سے آخری داعی، نبی اور پیغمبر تھے اور وہی اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر، حاکم اور فرمانروا تھے، آپ کے احکام کی بجا آوری عین احکام خدا کی بجا آوری ہے :

وَمَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ (نساء: ۵۸) جبر نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔ آپ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے آپ کے جوبانشین اور خلفاء ہوئے اُن میں بھی دین و دنیا کی یہی جامعیت تھی وہ جس طرح مسلمانوں کے امیر و حاکم اور ان کی سلطنت کے فرمانروا تھے، اسی طرح وہ دین کے پیغمبر، امام اور مجتہد تھے اور ان کے احکام کی تعمیل بھی عین خدا اور رسول کے احکام کی تعمیل تھی اور اب بھی مسلمان بادشاہوں کے و احکام جو خدا اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہوں، ہر مسلمان پر واجب التعمیل ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :

من اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصی امیری فقد عصانی ۔ جس نے میرے امیر کا کمانا، اس نے میرا کمانا، جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی ۔

سلطنت اور دین کا یہ اتحاد اسلام کا سب سے بڑا نصب العین ہے، احکام الہی کے مطابق سلطنت کا جو کام بھی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے کیا جائے وہ عین دین اور عین عبادت ہے، یہاں تک کہ امر الہی کا رعایا کی خدمت کرنا اور رعایا کا اپنے امراء اور حکام کی اطاعت کرنا بھی اطاعت الہی ہے بشرطیکہ دونوں نیت اور غرض اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالانا ہو، غرض اسلام کی نظر میں سلطنت اور دین میں تفریق کاموں کے نوعیت سے نہیں بلکہ کاموں کی غرض و نیت سے ہے، خدا کے لیے اور خدا کی خوشنودی کے حصول کے لیے سیاست و سلطنت سے متعلق جو کام بھی حسب حکم الہی کیا جائے وہ دین ہے، امام کی امامت، خلیفہ کی خلافت، راعی کی رعیت، والی کی ولایت، امیر کی امارت، حاکم کی حکومت، رعایا کی نگرانی، قاضی کی دادگری، عمال کا عمل، سپاہی کا قتال، مجاہد کا جہاد، محاصل کی ادائی، امراء کی واجبی اطاعت، غرض سلطنت کے تمام متعلقہ شعبوں سے متعلق جو کام بھی حسب احکام الہی اللہ کے لیے کیا جائے، وہ سب دین اور اطاعت اور موجب قربت ہے۔ سلاطین اگر اپنی سلطنت اور امراء اپنی امارت اور اسی طرح دوسری مفوضہ خدا کے ذمہ دار اگر اپنی ذمہ داریوں اور خدمتوں کو چھوڑ کر شب و روز کسی گوشہ میں بیٹھ کر صرف یاد الہی میں مصروف رہیں۔ جب بھی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے فرائض سے غافل قرار پائیں گے، فرائض واجبہ و موکدات کی بجا آوری کے بعد ان کی بہترین عبادت یہی قرار دی گئی ہے کہ وہ خلوص کے ساتھ اپنے محولہ فرائض کی بجا آوری میں مصروف رہیں، حضرت داؤد کا جو قصہ سورہ ص میں ہے جس میں چند ادنیٰ خواہوں کا دیوار پھانڈ کر حضرت داؤد علیہ السلام کے عبادت خانہ میں داخل ہو جانے اور ایک مقدمہ کے پیش کرنے کا ذکر ہے، قصہ خوانوں نے اس کو ایک بیہودہ کہانی بنا دیا ہے، حالانکہ وہ ان کی تنبیہ اس باب میں ہے کہ فرائض کی ادائیگی کے بعد خلیفہ کی سب سے بڑی عبادت رعایا کی خدمت ان کے معاملات کی دادگری اور ان کے کاموں کی نگرانی ہے اور یہی احساس فرض ہے جس پر حضرت داؤد علیہ السلام کو متنبہ کیا گیا :

وَلَقَدْ دَاوُدُ اِنَّمَا فَتَنَّهٗ فَاَسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَاَنَابَ فَغُفِرَ لَہٗ ذٰلِکَ وَاِنَّ لَہٗ عِنْدَ خٰلِقِہٖ لَوْفًی وَّحُسْنً مَّا یَبْیٰحُ یٰدَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنَاکَ خَلِیْفَۃَ فِی الْاَرْضِ فَاحْکُم بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَاَلَمْ یَتَّبِعِ الْہُوٰی فِیضَلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (ص: ۲۵) اور داؤد نے سمجھا کہ ہم نے (یعنی خدا نے) اُن کو آزمایا ہے تو اپنے پروردگار سے انہوں نے معافی چاہی اور رکوع میں گر گئے اور رجوع کیا تو ہم نے ان کو معاف کر دیا اور انکو ہمارے قرب کا درجہ اور پھر آنے کی اچھی جگہ حاصل ہے، اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکم کرو اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دے گا۔

آگے پیچھے کی آیتوں کے درمیان ربط و نظم سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سلطنت کے فرائض اور مقدمات کے فیصلوں کو چھوڑ کر عبادت خانہ کے دروازہ کو بند کر کے خدا کی عبادت میں مصروف رہ گئے، تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی اور بتایا گیا کہ خلیفہ کافر فرض یہ ہے کہ حسب احکام الہی فرائض خلافت کی ادائیگی میں مصروف رہے۔

جامع ترمذی اور مستدرک حاکم میں ایک حدیث ہے جو گویا اس آیت کی تفسیر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما من امام یغلق بابہ من ذوی الحاجۃ والخلۃ و المسکنۃ الا غلق اللہ ابواب السماء دون خلۃ و حاجتہ و مسکنہ ترمذی ابواب الاحکام ۲۲۷

من ولی من امر المسلمین شیئاً فاحتجب دون خلۃ و حاجتہم و فقرہم و فاقہم لاحتجب اللہ عزوجل یوم القیامۃ دون خلۃ و فاقۃ و فقرہ (مستدرک حاکم کتاب الاحکام ۴۲، ص ۹۲ حیدرآباد)

خلفائے راشدین نے ان احکام کی پیروی یہاں تک کی کہ انہوں نے اینٹ اور چوڑے کی کوئی چھائی دیواری بھی اپنے لیے نہیں کھڑی کی اور اپنی حق طلبہ علیا کے بیچ میں ان کے لیے اجازت حاصل کر نیوالے غلاموں کے سوا کوئی اوٹ قائم نہیں کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے جو کوہ کے والی تھے، اپنے رہنے کے لیے ایک محل بنوایا اور اس میں بھاٹک لگوایا، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر پہنچی تو انہوں نے خاص طور سے مدینہ سے محمد بن مسلمہؓ کو اس لیے بھیجا کہ اس بھاٹک میں آگ لگا کر چلے آئیں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، وہ سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے وہاں گئے اور پہنچنے کے ساتھ اس بھاٹک میں آگ لگا دی، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ان کو اپنے پاس ٹھہرانا چاہا تو اس کو بھی قبول نہیں کیا اور مدینہ واپس چلے آئے (ابن حنبل ج ۳ ص ۵۵ مصر)

حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں حکم آوروں کے خوف سے جب محل میں لوگوں کی آمد و رفت پر روک ٹوک قائم کی اور ایک صحابی نے ان کو اس حکم نبوی سے باخبر کیا تو انہوں نے یہ تدبیر کی کہ بھاٹک پر ایک آدمی کو اس غرض سے مقرر کیا جو اہل حاجت پہنچے تو اس کی ضرورت سن کر ان کو مطلع کرے (ترمذی ابواب الاحکام)

قرآن پاک میں بار بار حکام کو عدل و انصاف سے کام لینے اور اپنے ذمہ دارانہ فرائض کی بجا آوری کی تاکید کی گئی ہے، خصوصیت کے ساتھ ذیل کی آیتیں اپنے عوام کے لحاظ سے فرائض حکومت کی پوری توضیح کرتی ہیں۔

اَنْ تُوَدَّ اِلَہَ مَا نَحَبْتَ اِلَیْہِمْ اَوْ اَخَا حَکْمَتُکُمْ بَیْنِیْ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو، اور جب ان کو اسلام میں کسی کے مکان میں داخل ہونے کے لیے اذن کا حکم ہے اسے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور خلفائے کرام نے دعا کی ہے کہ تمہیں ہر گز عام بیگ مقامت، مساجد اور عدالت گاہوں میں اس جگہ کی حرمت ہے اور نہ ایسے پہرہ داروں کی

النَّاسِ اَنْ یَّحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللہَ لَیَعْلَمُ بِہِمْ اِنَّ اللہَ کَانَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا یَاٰیہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللہَ وَاطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ جَاہِلًا تَارَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ الَّذِیْ خُیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا (نساء: ۵۸)

یہ آیتیں اسلامی سلطنت کے آئین کے باب میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں، جس کی تفصیل نے مقام پر آئے گی آیت پاک کا پہلا ٹکڑا اپنے معنی کے لحاظ سے اہل تفسیر کی تصریح کے مطابق اس کا اطلاق حکام پر بھی ہوتا ہے اور یہ بات کہہ کر صاحب حق کو اس کا حق ادا کیا جائے، امانت کا اعلیٰ درجہ اور حکومت کا پہلا فرض ہے۔

یہ اور اسی معنی کی اور آیتیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں پورا انصاف برتا جائے، اور جس پیمانہ سے تم دوسروں کے لیے تولتے ہو، اسی پیمانہ سے اپنے لیے بھی تولو۔

وَنِیْلُ لِلْمُظْلَمِیْنَ الَّذِیْنَ اِفْکَرْنَا لُوْا عَلٰی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا کَا لُوْہُمْ اَوْ ذُرُّوْہُمْ یُخْسِرُوْنَ (مطففین: ۱۰)

یہ تول میں گھٹانا اور بڑھانا انصاف کے خلاف ہے، اور خلاف انصاف کرنا اللہ کی رحمت سے محروم رہے گا، اللہ کی محبت کے مستحق منصف اور عدل پر درہی ہیں،

اِنَّ اللہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (مائده، حجرات: ۶) اور اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔ اس آیت کی وسعت میں ہر طبقہ کے انصاف کر نیوالے داخل ہیں۔

اس کے برخلاف کر نیوالوں کے متعلق ارشاد ہے۔

وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الظَّالِمِیْنَ (آل عمران: ۶۱) اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اِنَّہُ یُحِبُّ الظَّالِمِیْنَ (شوری: ۴۱) بے شک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

ظلم کے معنی کسی دوسرے کے حق کو دہانے کے ہیں، چاہے وہ اپنے ہی نفس کا ہو، یا عام بندوں کا ہو، یا خدا تعالیٰ کا ہو، ان آیتوں سے مقصود یہ ہے کہ حکومت اور اس کے فرائض اسلام میں دین کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہونا نواب اور اس میں قصور گناہ ہے اور بحسن و خوبی عہدہ برآ ہونا یہی ہے کہ وہ احکام الہی کے تحت ادا ہوں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (مائدہ ۷۷) اور جو اللہ کے احکام کے مطابق حکم نہ کریں وہی نافرمان ہیں۔

احادیث میں بھی اس کی تصریحات ہیں، ارشاد ہے:

إِلَّا إِلَهُ النَّاسِ لَا يَقْبَلُ اللَّهُ صَلَوةَ إِمَامٍ حَكَمَ بِغَيْرِ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ - (مستدرک ج ۴، ص ۸۹ کتاب الاحکام) ہاں اے لوگو! جو امام، خدا نے جو قانون اتارے اس کو چھوڑ کر کچھ فیصلہ کرے، اس کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرے گا۔

سبب ظاہر ہے کہ نماز بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور انقیاد کی تمثیل ہے، اب جو شخص ایک طرف اس کامل اطاعت اور انقیاد کا اظہار کرتا ہے اور دوسری طرف اس کی صریح مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے، وہ منافق ہے اور اس لیے اس کی نماز یعنی اظہار اطاعت ہار گا واللہ اعلم بالصواب۔

اسی سلسلہ میں ان حدیثوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے، جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت و فرمانروائی بھی ایک مذہبی فریضہ ہے جو لوگ اس فریضہ سے حسب احکام الہی بخوبی عہدہ برآ ہوں، ان کے لیے آخرت میں رحمت الہی کا سایہ ہے، اور جو اس امتحان میں پورے نہ اتریں ان کے لیے وہ سزائیں ہیں جو دوسری زندگی میں ان کے لیے مقرر کی گئی ہیں، منسما یا:

إِلَا إِمَامَ الَّذِي عَلَى النَّاسِ رَاعٍ هُوَ مَسْئُولٌ - وہ امام جو لوگوں پر مقرر ہے وہ نگران کا رتہ اس سے رعیتہ در صحیح بخاری ج ۲، ص ۵۵ کتاب اللکام) اس کے زیر نگرانی اشخاص کے متعلق باز پرس ہوگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ امیر اور امام بڑی ذمہ داریوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں، اسلامی امارت و خلافت تاج و تخت کی بہار اور عیش و عشرت کا گلزار نہیں، ذمہ داریوں کا خارزار ہے، جو اس سے سلامت گزر گیا، اس کے لیے دنیا کی سعادت اور نیک نامی اور آخرت کا ابدی آرام و آرائش ہے اور جو اس میں الجھ کر رہ گیا وہ اس دنیا میں بھی ذلیل و بدنام ہوگا اور آخرت میں بھی رسوا و خوار ہوگا۔

مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيهِ اللَّهُ رَعِيَّةً جَسَ بَنَدَهُ كَوَالِدٍ كَسَى رَعِيَّتَهُ كَانْكَرَانَ بَنَانِ وَأَرْوَهُ فَلَمْ يَحْطَ بِهَا بِنَجَاتِهِ إِلَّا لَمْ يَجِدْ رَاحَةً - جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگران بنائے اور وہ اس کی خیر خواہی پوری پوری نہ کرے تو وہ جنت الجنۃ (بخاری و مسلم حوالہ سابق) کی بو بھی نہ پائے گا۔

حضرت معقل بن یسار ایک صحابی ہیں ان کے مرض الموت میں بعبرہ کاسفاک امیر عبید اللہ بن زیاد انکی عیادت کو آیا انہوں نے امیر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آج میں تمہیں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک پیغام سنا دینا چاہتا ہوں اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری زندگی ابھی اور باقی ہے تو میں نہ سنانا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے:

مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيهِ اللَّهُ رَعِيَّةً يَمُوتُ يَوْمَ يَمُوتُ وَهُوَ غَاشٍ لِرَعِيَّتِهِ إِلَّا خَرَّمَهُ اللَّهُ - جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگران بنائے، وہ مرتے دم اس حال میں مرے کہ وہ اپنی رعیت کیساتھ غداری

عليه الجنة (مسلم، کتاب الامارہ) کرتا تھا تو اللہ اس پر جنت کو حرام کر دے گا۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ امارت و حکومت کی ذمہ داری اسلام کی شریعت میں کتنی بڑی ہے، ایک اور صحابی جن کا نام عائذ بن عمر رضی اللہ عنہ ہے، وہ مرض الموت کا بھی انتظار نہیں کرتے عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں خوب پہنچ جاتے اور اس کو پیار سے خطاب کر کے کہتے ہیں اے بیٹے! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے:

إِنْ شَرَّ الزَّعَاءِ الْمُحْطَمَةِ (مسلم، کتاب الامارہ) سب برا راعی (امیر) وہ ہے جو اپنے رعیت کو توڑ ڈالے۔ تو تو ان میں سے نہ بن، اس نے کہا، آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں بھوسی ہیں، فود ابولے کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں کوئی بھوسی بھی تھا، بھوسی تو اوروں میں تھے، اور ان کے بعد والے ہیں:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء فرمایا کرتے تھے، ایک نبی گذر جاتا تھا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا تھا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، نبوت مجھ پر ختم ہوگئی البتہ خلفاء ہوں گے، اور بہت ہوں گے، انہی کے ہاتھ میں امت کی سیاست کی باگ ہوگی، صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! تو ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ فرمایا پہلے کی بیعت کرو، پھر اس کے بعد والے کی، پھر عہد بہ عہد اوروں کی، ان کا حق ان کو ادا کیا کرو (یعنی اپنے حق کی پرسش خدا پر چھوڑ دو)

فَإِنَّ اللَّهَ سَأَلَهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُمْ - کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے متعلق باز پرس فرمائے گا جن کی نگرانی ان کے سپرد فرمائی ہے۔ (صحیح بخاری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے امراء کے حق میں یہ دعا فرمائی ہے:

اللَّهُمَّ مَنْ وَلِيَ مِنْ أُمَرَاءِ شَيْئًا فَشَقَّ عَلَيْهِمْ فَاشْتَقْ عَلَيْهِ وَ مَنْ وَلِيَ مِنْ أُمَرَاءِ شَيْئًا فَفَرَّقْ بَيْنَهُمْ فَارْفُتْ بِهِ (مسلم)

اے اللہ! جو کوئی میری امت کی کسی بات کا دیکھو کہ کسی حصکا، بھی والی ہوا اور وہ ان پر سختی کرے تو تو بھی اس پر سختی کرنا اور جو ان سے مرہانی سے ہمیش آئے تو تو بھی اس پر مرہانی فرما۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ کی وسعت میں بادشاہ سے لیکر ادنیٰ افسر تک شامل ہیں، اور ہر ایک کے اپنے دائرہ حکومت کی ذمہ داری عائد ہے ایک اور حدیث پاک میں اس دائرہ کی وسعت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ہاں! تم سب نگران کار ہو، اور تم سب سے اپنے زیر نگرانی اشخاص و رعایا کی بابت پوچھ ہوگی تو لوگوں کا امیر نگران کار ہے اس کے زیر نگران کے متعلق پرسش ہوگی اور مرد اپنے گھر والوں کا نگران کار ہے اور اس سے اس کے گھر والوں کی پرسش کی جائیگی اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بال بچوں کی نگران ہے۔

إِلَّا كَلَّكُمْ رَاعٍ وَكَلَّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلَى أَهْلِ بَيْتِهِ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْهُمْ وَالْمَرْءُ رَاعِيَةٌ عَلَى بَيْتِ بَعْلِهَا وَوَلَدِهِ وَهِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْهُمْ وَالْعَبْدُ رَاعٍ عَلَى مَالِ سَيِّدِهِ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْهُ إِلَّا فَكَلَّكُمْ رَاعٍ وَكَلَّكُمْ مَسْئُولٌ

عن رعیتہ (مسلم و صحیح بخاری) اس سے ان کے متعلق سوال ہوگا، اور غلام اپنے آقا کے مال کا نگران ہے اس سے اس کی بابت پوچھا جائے گا، تو ملن ہشیار رہو، تم سب نگران کار ہو اور تم سے اس کے ذریعہ نگرانوں کے بابت باز پرس کی جائے گی۔

لفظ رعیت اس موقع پر مخصوص لفظ کی تحقیق مناسب معلوم ہوتی ہے، جو ہماری زبان میں عام طور پر رائج ہے اور وہ رعیت ہے، اور ذمہ داری کے لحاظ سے وہ اپنی حقیقت سے بالکل خالی ہو گئی ہے، حدیثوں میں لفظ راعی اور رعیت بار بار آئے ہیں، یہ الفاظ لفظ "رعی" سے نکلے ہیں، جس کے اصل معنی جانوروں کے چرانے کے ہیں، راعی چرواہا اور رعیت وہ ہے جس کو وہ چرائے اور جس کی وہ نگہبانی کرے، اس سے ظاہر ہے کہ کسی کی رعیت وہ ہے جس کی تربیت و پرورش و نگرانی اور حفاظت کسی راعی و محافظ کے سپرد ہو تو در حقیقت ایک امیر کی حیثیت ایک شفیق و محافظ چرواہے کی ہے، جو اپنے گلے کو سرسبز چراگا ہوں میں لے جاتا ہے، اور ان کی شکم سیری کا سامان کرتا ہے، درندوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے اور حادثات سے ان کو بچاتا ہے، اس تشریح کے مطابق یہ غور طلب ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر لفظ "رعیت" کس قدر شفقت آمیز اور پُر محبت معنوں میں آیا ہے اور ظالم و سفاک امراء اپنے عمل سے اس کو کتنے ذلیل اور پست معنوں میں عملاً استعمال کر رہے ہیں حالانکہ اسی لفظ میں ان کی ذمہ داریوں کا ایک بڑا دفتر پوشیدہ ہے، جو امام عادل اپنے فرائض سے بخوبی عہدہ بردار ہوں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نسبت یہ بشارت دی ہے:

ان المقسطین عند الله على منابر من نور عن يمين الرحمن وكلتا يديه يمين الذين يعدلون في حكمهم وأهليهم وما ولوا۔ (صحیح مسلم کتاب الامارہ)

بے شک انصاف کرنے والے (حکام و امراء) اللہ تعالیٰ کے پاس نور کے منبروں پر اس کے داہنے ہاتھ پر ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے فیصلہ میں اپنے اپنے لوگوں میں اور اپنے زیر حکومت امراء میں عادل ہوں۔

اس رفعت اور بلندی سے جو ایسے عادل حاکموں، منصف امیروں اور سلطانوں کو قیامت کے روز حاصل ہوگی، ظاہر ہے کہ عادلانہ حکومت اور منصفانہ سلطنت کتنی بڑی عبادت ہے، جامع ترمذی میں ہے:

ان احب الناس الى الله يوم القيامة وادناهم مجلسا امام عادل والبعث الى الله وابعدهم منه مجلسا امام جائر۔ (ترمذی ابواب الاحکام)

بے شبہ سب لوگوں سے خدا کو محبوب اور خدا سے قریب امام عادل ہوگا، اور خدا کے نزدیک سب سے مبغوض اور خدا سے دور وہ امام ہوگا، جو ظالم ہو۔

اس کے برخلاف جو امام اور حاکم و امیر عدل و انصاف اور رعایا پروری اور خیر خواہی سے دور ہوں گے وہ اللہ کی رحمت سے بھی دور ہوں گے، منسرایا:

۱۔ امن امیر ملی اموال المسلمین۔ (صحیح مسلم، کتاب الامارہ)

جو امیر مسلمانوں کے کام کا والی ہو، پھر وہ ان کے لیے محنت نہیں کرتا اور ان کا خیر خواہ نہیں، وہ ان کیساتھ بہشت میں داخل نہ ہوگا۔

ما من وال یلی رعیت من الصلین فی موت و هو غاش لہم الا حرم اللہ علیہ الجنة (صحیح بخاری، کتاب الاحکام)

کوئی والی جو مسلمانوں کی کسی ذریعہ نگرانی جماعت کا والی ہو، وہ اس حال میں مرے کہ وہ ان مسلمانوں کے ساتھ غداری کا مرتکب ہو، اس پر جنت حرام ہے۔

انما الا ما من جنة یقاتل من ورائہ و یتقی بہ فان امر یتقوی اللہ وعدل فان له بذلك اجرا وان امر بغیرہ فان علیہ وزرا (نسائی کتاب البیعة)

امام ڈھال ہے اس کے پیچھے اس کی پناہ میں لڑا جاتا ہے تو اگر وہ اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کے مطابق حکم کرے اور عدل کرے تو اس کو اس کا بڑا انعام ملے گا اور اگر غیر تقویٰ کا حکم کرے اور عدل نہ کرے تو اس کے لیے بڑی سزا ہے۔

یہ حدیثیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام میں حکومت و ریاست اور سلطنت و ولایت بھی امور دین کا درجہ رکھتی ہیں اور وہ بھی ثواب و عذاب اور جزاء و سزا کی اسی طرح موجب ہیں جس طرح دین کے دوسرے امور و اعمال، اور وہ بھی ایک مسلمان کے سامنے جنت یا دوزخ کا دروازہ کھولنے میں اعمال و عبادات کے دوسرے شعبوں سے کم نہیں، اور اسلام کی شریعت میں یہ دین ہی کا ایک حصہ ہے، کیونکہ یہاں دین کے معنی احکام الہی ہیں یا قوانین الہی ہیں۔ یہ احکام الہی اور قوانین الہی انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے یکساں متعلق ہیں، اس بنا پر سلطنت و ولایت اور حکومت و ریاست کے کاروبار کا نظم و نسق اور اہتمام و انصرام بھی دین ہی کا ایک جز ہے۔

ایک مدت سے علما کی گوشہ گیری اور صوفیہ کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلادیا ہے کہ قیام سلطنت اور امور سلطنت میں دخل و تدبیر دنیا کا کام ہے، جس سے اہل علم اور اہل افتاد کو کنارہ کش رہنا چاہیے، حافظ شیرازی کا یہ مشہور شعر اسی تصور کا غماز ہے:

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخدوش رموز مملکت خویش خسرواں دانشدہ
راے حافظ تو گدائے گوشہ نشین ہے، زیادہ شور و غل مت کر کہ اپنی مملکت کے رموز و اسرار بادشاہ ہی جانتے ہیں، تم کمان سے کیا سروکار؟

لیکن اسلام اس خسروی کا قائل نہیں، اس کی نگاہ میں سلطنت احکام الہی کی تبلیغ اور اجراء کے لیے ہے لہٰذا حافظ علیہ الرحمہ کے اس شعر کا یہ عمل بھی ہو سکتا ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے اسرار و مصالح کے تلاش نہیں کرنی چاہیے، جب کہ دنیا کے بادشاہ اپنے رموز و مصالح سے غیروں کو آگاہ نہیں کرتے، اگر کوئی بادشاہ کی مرنی کے خلاف ان کے جاننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے بغیر اپنی طرف سے احکام الہی کے رموز و اسرار کی تلاش و طلب نہیں کرنی چاہیے:

اور یہ مین دین ہے، اسلام میں جس قتال و جہاد کی دعوت بر ملا دی گئی ہے اور جس پر آخر دی نعمتوں کے بڑے بڑے وعدے اللہ تعالیٰ نے فرمائے ہیں اور جس سے عالمی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات مقدس اور حضرات خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کی زندگیاں سرتاپا مہمور ہیں، اس سے مقصود اصلی حکام الہی کی تبلیغ تنفیذ اور اجراء ہی تھا، جہاد سے فرار پر غضب الہی اور جہنم کی وعید ہے، اور میدان جہاد کے صبر ثبات پر صادق قدم اور متقی ہونے کی بشارت ہے، قرآن میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَانْحَرِبُوا عَنْهُمْ إِذَا رَأَوْهُمُ اخْرُجُوا مِنْهُمْ يَوْمَ يُؤْتِيهِمْ نَذِيرُهُمْ أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ أَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ آيَاتُ أَنْبِيَائِهِمْ مِنْ قَبْلُ فَالْتَقَالُوا مِنْهُمْ فَهُمْ كَذِبُونَ أَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ آيَاتُ أَنْبِيَائِهِمْ مِنْ قَبْلُ فَالْتَقَالُوا مِنْهُمْ فَهُمْ كَذِبُونَ أَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ آيَاتُ أَنْبِيَائِهِمْ مِنْ قَبْلُ فَالْتَقَالُوا مِنْهُمْ فَهُمْ كَذِبُونَ

اے اہل ایمان! جب میدان جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا اور جو شخص جنگ کے روز اس صورت کے سالٹائی کے لیے کنارے کنارے چلے (یعنی حکمت عملی سے دشمن کو مارے) یا اپنی فوج میں جاملنا چاہیے ان پیٹھ پھیرے گا تو دیکھو کہ وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گیا اور اسکا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت ہی بُری جگہ ہے۔ اور سختی اور تکلیف میں اور دمعہ کر، کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں، یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جہاد و قتال فی سبیل اللہ، انصاف، اقامت دین، تنفیذ حکم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تمام کاروبار کو جس کا بڑا حصہ امامت و خلافت اور اس کے ماتحت شعبوں اور ضعیفوں سے متعلق ہے، عام عبادات و اعمال صالحہ سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس تصور اور عقیدہ کی بنا پر کہ اقامت دین کی راہ میں خون شہادت کا ایک قطرہ بھی مومن کے اعمال نامہ اور گناہوں کے دفتر کو دم کے دم میں دھو دیتا ہے، حضرات صحابہ ہر وقت جہاد و قتال کے مشتاق اور اس راہ میں شہادت کے طالب رہتے تھے۔

فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَآخَرُوا مِنْ دِينِهِمْ قَاتِلُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتِلُوا وَقَاتِلُوا لَوْ كَفَرْتُمْ عَنْهُمْ يَتَّخِذُهُمْ وَلَا يَخْلَتُهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَوْ أَنَّ مِنْكُمْ عَنِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِنْدَ الْحُسْنِ الثَّوَابِ (آل عمران)

تو جو لوگ میرے لیے وطن چھوڑ گئے اور اپنے گھر سے نکلے گئے اور ستائے گئے اور لڑے اور قتل کیے گئے میں ان کے گناہ دور کر دوں گا اور ان کو بہشتوں میں داخل کروں گا اور جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (یعنی خدا کے ہاں بدلہ ہے، اور خدا کے ہاں اچھا بدلہ ہے۔)

خود لفظ دین قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے، ان میں سے ایک معنی احکام الہی کی اطاعت، تنفیذ اور اقامت کے بھی ہیں، سورہ نور میں ہے:

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ (نور ۱) اور ان دونوں مجرموں کیساتھ اللہ کے دین میں تم کو رحم نہ آوے۔

کھلی بات ہے کہ اللہ کے دین سے مقصود یہاں احکام الہی کی تنفیذ و اجراء سے ہے اس طرح سورہ بقرہ کی اس آیت میں

وَقَاتِلُوا لَهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَ يَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ (بقرہ ۲۱۷) اور ان سے اس وقت تک قتال کرتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے۔

صرف حکم الہی کی اطاعت کو دین "فرمایا گیا ہے، سورہ انفال کی اس آیت میں

وَقَاتِلُوا لَهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَ يَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ (انفال ۳۹) اور ان لوگوں سے قتال کرتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ و کفر کا فساد باقی نہ رہے اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے۔

بھی حکم و قانون الہی کی تسلیم و اطاعت ہی کو دین فرمایا گیا ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوانہ کوئی اطاعت کے مائل ہے اور نہ عبادت کے، اسی کا ایک فیصلہ ہے جو آسمان سے زمین تک جاری ہے۔ اِنْ الْحُكْمُ اِلَّا لِلَّهِ (انعام، یوسف) اَلَا لَهُ الْحُكْمُ (انعام) ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

وَلَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّينُ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ (نحل ۷۷) اور اسی خدا کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اسی کی لازمی اطاعت ہے۔

یہاں بھی دین کے معنی احکام الہی کی اطاعت ہی کے زیادہ موزوں اور نظم قرآنی کے مطابق ہے۔ سلطنت و ملکیت کی حقیقت | اب دین کی تشریح کے بعد حکومت و سلطنت و ولایت کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے عام لوگ حکومت و سلطنت کو عیش و تنعم کے ایوان زرنگار، تاج اور زمرہ کی تخت کی روشنی اور زریں کمر بند غلاموں کے جھرمٹ میں تلاش کرتے ہیں، یا جلال و جبروت اور قہر و ہیبت کی تلواروں کے سلئے میں، لیکن اسلام نے جس حکومت کی تعلیم دی ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی جو عملی مثال پیش کی ہے وہ ان تمام مناظر سے قطعاً خالی ہے۔

اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کر دیئے | سلطنت و حکومت اور ولایت و ریاست کا لایع الوقت

تخیل اسلام کے قانون میں اصلاً نہیں ہے، بلکہ اسلام نے سلطنت و حکومت اور بادشاہی و شہنشاہی کے الفاظ کو بھی جو ہر زبان میں رایج تھے، قطعاً چھوڑ دیا، سب سے عام لفظ ملک کا تھا اور اس سے اونچا لفظ شہنشاہ کا تھا، ایران کے شہنشاہ کسریٰ اور روم کے امپریٹر کہلاتے تھے، مگر تعلیم محمدی نے ان سب لفظوں سے جو جبر و قہر و ظلم و ستم کے منظر تھے، پر ہیز کیا، الملک کے مادہ میں ملکیت اور مالکیت کا تصور ہے جو اسلامی عقیدہ کے سراسر منافی ہے اس لیے اس لفظ سے بھی پر ہیز کیا، اسلام کی تعلیم میں حقیقی مالک اور حقیقی بادشاہ اللہ تعالیٰ ہے اس لیے الملک ہونے کا استحقاق اسی کو ہے، چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ وصف بار بار بیان ہوا ہے:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ اِلٰهِ النَّاسِ ۝ (الناس ۱) کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی، لوگوں کے معبود برحق کی۔

الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ (حشر: ۲)

فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ (مومن: ۶۱)

الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ الْغَزِيْرُ

الْحَكِيْمُ (جمع: ۱)

بادشاہ حقیقی، پاک ذات (ہر عیب سے) امن و امان والا

تو خدا جو بجا بادشاہ ہے۔

بادشاہ حقیقی، پاک ذات، زبردست حکمت

والا ہے۔

یہ آیت قرآن پاک میں چھ دفعہ آئی ہے اور ہر جگہ اللہ تعالیٰ ہی کو 'الملک الحق' یعنی بادشاہ برحق فرمایا گیا ہے، یہاں ایک نکتہ خاص طور سے لحاظ کے قابل ہے، ان آیتوں میں کیسے ہی تنہا الملک نہیں آیا ہے بلکہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت اور اوصاف ضرور لگائی گئی ہے، مثلاً اوپر کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کو ملک الناس لوگوں کا بادشاہ کہا گیا تو ساتھ ہی اس سے پہلے رب الناس لوگوں کا پالنے والا بھی کہہ دیا گیا ہے تاکہ اس کی ربوبیت کا بھی اظہار ہو، دوسری آیت میں الملک کے ساتھ اول القدوس (مقدس و پاک) اور پھر السلام (امن و امان والا) کہا گیا، تاکہ اس کے ساتھ اس کی پاکی و سلامتی ظاہر ہو جائے، تیسری آیت میں الملک کے ساتھ الحق (برحق) کی صفت آئی ہے، چوتھی آیت میں الملک کے ساتھ القدوس (پاک) العزیز (غالب) الحکیم (حکمت والا) کی صفت آئی ہے ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الملک کے لفظ کے اندر ظلم و صفا کی، قہر و جبر اور بے رحمی و سخت دلی کا ایسا مفہوم ذہن انسانی میں پیدا ہو گیا تھا کہ اس لفظ کے ساتھ کسی نئی صفت کے بڑھانے بغیر اس مفہوم کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں جہاں اپنے لیے اس لفظ کا استعمال کیا ہے اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت ضروری لگا دی ہے۔

لفظ ملک الملوک کی ممانعت | عربی میں ملک الاملاک یا ملک الملوک اور فارسی میں شانشاہ یعنی شاہ شاہان بولا جاتا تھا اور اس کا تصور بادشاہوں کے تعلق سے ہر زبان میں مبالغہ کے ساتھ پایا جاتا ہے اسلام میں شاہ شاہان، شہنشاہ، ملک الملوک صرف ایک ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف ارشاد فرمایا:

ان اخضع الہ سما عند اللہ رجل تسی ملک سب سے بدتر نام اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی آدمی الہ ملک (صحیح بخاری، کتاب الادب) اپنے آپ کو شہنشاہ کہے۔

معانی جن الفاظ سے ادا کیے جاتے ہیں اگر ان کی اصلیت محفوظ ہو تو معلوم ہوگا کہ الفاظ کے اندر بڑی حقیقت چھپی رہتی ہے، اسلام کی زبان میں اپنی طرز حکومت کے فخر عامل کا نام خلیفہ اور اس کی حکومت کا نام خلافت ہے، خلیفہ عربی زبان میں قائم مقام اور نائب کو کہتے ہیں، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خود حاکم و فرمانروا نہیں بلکہ وہ اس حکومت میں کسی کا نائب اور قائم مقام ہے، سوال یہ ہے کہ وہ کس کی نیابت کرتا ہے اور کس کا قائم مقام ہے؟

حضرت آدمؑ کا قصہ قرآن پاک اور توراہ دونوں صحیفوں میں مذکور ہے، مگر دونوں کے نتیجے الگ الگ ہیں، توراہ میں یہ بیان صرف آدمؑ کے آغاز پیدائش کی تاریخ کی حیثیت سے ہے، لیکن قرآن کا یہ بیان اسلام کے

دینیات اور سیاسیات کا ایک بنیادی پتھر ہے، اسلام میں ایک طرف تو انسان کا مکلف ہونا، اس کا اصلی مقام بہشت ہونا، جزاء و سزا کا راز، رسالت و نبوت کی ضرورت اور پیغمبروں کے آنے کی مصلحت اس قصہ سے ظاہر ہوتی ہے، دوسری طرف کائنات میں انسان کے اصلی مقام و مرتبہ کی تعیین، دنیا میں اس کے فرائض و احکام الہی کی بجا آوری کی صورت اور خدا کی دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کے برتاؤ کی حیثیت واضح ہوتی ہے، پہلی چیز اسلام کے اساسی عقائد ہیں اور دوسری چیز اسلامی سیاسیات کے بنیادی مبادی ہیں۔

قرآن پاک میں اس قصہ کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے:

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (بقرہ: ۳۰)

اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

یہ خلیفہ حضرت آدمؑ تھے، جو تمام بنی آدم کے قائم مقام ہو کر اس شرف سے ممتاز ہوئے، اس لیے دوسرے موقعوں پر آدمؑ کے بجائے سارے بنی آدم کو اس شرف سے مفتخر اور ممتاز فرمایا گیا ہے، چنانچہ فرمایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَا هُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (بنی اسرائیل: ۷۰)

اور اسی شرف و امتیاز کی بنا پر آدمؑ بنی آدم کے قائم مقام تھے، ان کو بنی آدم کے ساتھ ملا کر صیغہ جمع استعمال فرمایا گیا ہے:

رَٰحِبُطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يٰۤاٰتِيْنٰكُمْ مَّيْمَنَ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدًى فَلَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَاَزْوٰجُهُمْ يُخْزَوْنَ (بقرہ: ۳۰)

سورہ اعراف میں ارشاد الہی ہے:

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعٰيِشٍ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰئِكَةِ اسْجُدْوا لِآدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّا الْاِبْلِيسَ ط لَّمْ يَكُنْ مِنَ السَّٰجِدِيْنَ (اعراف: ۲۰)

اور ہم نے زمین میں تم کو قدرت بخشی اور اس میں تمہارے زندگی بسر کرنے کے معاشی طریقے بنائے، تم بہت کم میرا احسان کی قدر کرتے ہو اور ہم نے تم کو وجود بخشا، پھر تمہاری صورتیں بنائیں پھر فرشتوں سے کہہ کما کما کہ کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کما کما کہ کو سجدہ کر لیا تو انہوں نے سجدہ کیا۔

ان اختلاف کی تحریر کے زمانہ میں خاکسار کے خیالات اور ہر جوع ہونے تو سب سے پہلے اکتوبر ۱۹۷۷ء کے معارف میں آیت اختلاف کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، جس میں اسکی تصریح کی گئی ہے، یہ مضمون آج بھی پیش نظر رکھنے کے قابل ہے

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حضرت آدم کو جو عزت اور سرفرازی ملی وہ ان کی وراثت سے تمام بنی آدم کے حصہ میں آئی، اس لیے حضرت آدم کو زمین کی خلافت کی جو سعادت عطا ہوئی وہ پورے بنی نوع آدم کو نصیب ہوئی، سورہ انعام کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے :

وَهُوَ الَّذِي جَمَعَكُمْ خَلْقًا فِي الْاَرْضِ
وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ
لِّيَلْوَحَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ۔ اِنَّ
رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهُ لَغَفُورٌ
رَّحِيمٌ (انعام: ۲)

اور وہی (خدا) وہ ہے جس نے تم (انسانوں) کو زمین
میں خلیفہ بنایا اور (تم میں سے) ایک کا دوسرے پر درجہ
بڑھایا، تاکہ تم کو جو دیا اس میں تم کو آزمائے بیشک تیرا
پروردگار جلد سزا دینے والا ہے اور وہ بے خیرہ بخشے والا
مہربان ہے۔

یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی آدم کو یہ خلافت یا نبیائت کس کی عطا کی گئی ہے؟ قرآن پاک میں ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو نبیائت اور جانشینی عطا ہوتی رہی ہے، جیسے عاد کی قوم کو حضرت نوحؑ کی قوم کا جانشین، فرمایا:

وَاذْكُرُوا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ
بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ (اعراف ۶۱)
اور پھر تم کو عباد کا جانشین بنایا :

وَإِذْ نُنَاقِشُ الْعِبَادَ إِذْ جَعَلَكُمْ مِنْ بَعْدِ
عَادَ (اعراف: ۱۰) اور یاد کرو جب تم کو عَاد کے بعد
نبات بخشی۔
حضرت ہو واپنی قوم عاد کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہ کی

وَيَتَخَلَّفُ رِجِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ (ہود: ۵) تو میرا رب تمہارے علاوہ کسی اور قوم کو خلافت بخشنے کا
 حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ارشاد ہے :
 اِنْ يَشَاءُ يُذْهِبْكُمْ وَيَتَخَلَّفُ مِنْ اَبْدِكُمْ اور خدا چاہے گا تو تم کو لیجائے گا اور تمہارے بعد جس کو
 مَا يَشَاءُ كَمَا اَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَةِ چاہے خلافت و نیابت دے جس طرح تم کو دوسرے
 قَوْمٍ اٰخِرِينَ (انعام: ۱۶۱) لوگوں کی نسل سے پیدا کیا ۔

یہ مسلمانوں سے وعدہ فرمایا :
وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ
كََمَا أَسْتَخْلَفَ الْبَرِيَّةَ مِنْ قَبْلِهِمْ (نور: ۷۷)

اللہ نے تم میں سے ان سے، جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، وعدہ کیا کہ ان کو زمین میں خلافت بخشنے گا۔ جس طرح تم سے پہلوں کو خلافت بخشی۔

قرآن پاک کی چار آیتوں میں کچھ قوموں کو دوسری قوموں کا خلیفہ اور جانشین ہونا بیان فرمایا گیا ہے :

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ دَانَام ۱۹۱ اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین کے جانشین بنائے۔ سورہ یونس میں تصریح ہے :

اور تم سے پہلے ہم کئی امتوں کو، جب انہوں نے ظلم اختیار کیا، ہلاک کر چکے ہیں، اور ان کے پاس یہ غیر کھلی نشانیاں لیکر آئے، مگر وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے ہم گنہگار لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں، پھر ہم نے ان کے بعد تم لوگوں کو ملک میں خلیفہ بنایا تاکہ دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو

اس کے بعد نوحؑ کی قوم کی تباہی کے بعد ارشاد ہے :
 فَكَذَّبُوهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَمَنْ مَّعَهُ
 فِي الْفُلِّ وَجَعَلْنَاهُمْ خُلَافَةً
 (یسوسی : ۸)

لیکن ان لوگوں نے ان (نوح) کی تکذیب کی تو ہم نے
 ان (نوح) کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں سوار تھے
 سب کو طوفان سے بچا لیا اور انہیں (زمین میں) خلیفہ بنا دیا۔

سورہ فاطر میں سب انسانوں کو خلیفہ اور جانشین مقرر کیا گیا :
 هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْاَرْضِ وَجَبَّ
 فَصَحَّ كَفَرًا عَلَيْهِ كُفْرُهُ (فاطر: ۴۰)
 وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین
 بنایا، تو جس نے کفر کیا، اس کے کفر کا طرہ اسی کو ہے

حضرت داؤد کو خلافت بخشی گئی :
 اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِى الْاَرْضِ
 اِنَّا حٰكُمُوْا بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (ص: ۸۱)

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں جانشین بنایا ہے تو لوگوں
 میں انصاف کیساتھ فیصلے کیا کرو۔

یہ لفظ خلیفہ خَلَف سے مشتق ہے جس کے معنی پیچھے کے ہیں، اس لیے ایک کی غیر موجودگی میں، خواہ وہ اس کی موت کے سبب سے ہو یا غیبت کے سبب سے ہو، یا آنکھوں سے بظاہر اوجھل ہو نیکی صورت میں ہو، اس کی طرف سے اس کے پیچھے جو غائب ہو کر آئے وہ اس کا خلیفہ کہلاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے :

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ (اعراف و مریم ۲۱/۷) تو ان کے بعد ان کے جانشین آئے۔
 موت کے بعد کی جانشینی کی صورت ہے، دوسری آیت ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے طور پر جاتے وقت
 حضرت ہارونؑ سے فرمایا:

اَخْلَقْنِيْ فِيْ قَوْمٍ (اعراف ۱۶)

زندگی ہی میں جانشینی کی ایک شکل ہے :

وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَلَائِكَةً فِي

میری قوم میں میرے جانشین یا نائب بنو۔

اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتوں کو بناتے جو زمین

میں خلافت کرتے۔

اَلَّذِي رَضِيَ يَخْلُفُون (زخرف: ۶۱)

اوپر کی تین آیتوں میں خلافت کا لفظ ذرا ذرا سے فرق سے تین معنوں میں آیا ہے، پہلی آیت میں ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں، دوسری آیت میں ایک کے کہیں چلے جانے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں، اور تیسری آیت میں خلافت کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے، بعض نے کہا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو تمہارے جانشین ہوتے، بعض نے کہا کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو زمین پر آباد کر دیتا، اور تیسرے قول یہ ہے کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو بنانا جو زمین میں ایک دوسرے کے جانشین ہوتے چلے جاتے۔

امام راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے کہ خلافت کے اصلی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں، لیکن اس نیابت اور قائم مقامی کی تین صورتیں ہیں :

الخلافۃ النیابة عن الخیر
الخلافۃ النیابة عنہ واما لموتہ
واما لعجزہ واما لتشریف المستخلف
خلافت کے معنی کسی کے نائب ہونے کے ہیں اب یہ نیابت
اصل کی عدم موجودگی کے سبب سے ہو، یا اس کی موت کے
سبب سے ہو یا اس کے اپنے منصب سے عاجز ہونے کے سبب سے
ہو، یا نائب کو نیابت کی عزت بخشنے کے لیے ہو۔

پھر امام راغب نے مقدمہ آیتیں نقل کی ہیں، جن میں یہ تیسرے معنی ان کے نزدیک مناسب ہیں اور یہی معنی اللہ تعالیٰ کی نیابت کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں، مفتی آلوسی صاحب روح المعانی تک ہر آیت پر جس میں یہ لفظ آیا ہے تینوں معنی کے لیے مختلف قول نقل کیے ہیں اور خود کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ کس آیت میں خلافت کے کون سے معنی لینے چاہئیں، میرے دل میں یہ بات آتی ہے اور روزمرہ کا یہ عام محاورہ بھی ہے کہ جہاں متکلم یہ ظاہر کر دے کہ یہ شخص فلاں کا جانشین ہے وہاں تو اسی فلاں کا جانشین ہونا مقصود ہو گا اور جہاں متکلم اس کی تصریح نہ کرے تو اس سے مقصود خود متکلم کی جانشینی اور قائم مقامی ہو گی، اس اصول پر قرآن پاک کی ہر اس آیت میں جس میں اس جانشینی کی تصریح ہے، اس کی جانشینی مراد ہو گی، اور جہاں تصریح نہیں ہے وہاں خود متکلم قرآن یعنی اللہ تعالیٰ کی نیابت اور قائم مقامی ثابت ہو گی، جیسے قرآن پاک میں ایک آیت ہے :

وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِينَ
فِيهِ (حدید: ۱۰)

اب اس آیت میں ذکر نہیں کہ کس کا نائب بنایا ہے، اس لیے مفسرین دونوں طرف گئے ہیں، کچھ نے کہا ایک کے بعد دوسرے کو اس مال کا نائب بنایا، جیسے باپ کے بعد بیٹا نائب ہوتا ہے کچھ نے کہا کہ مال و حقیقت اللہ تعالیٰ کی ملک ہے، اس نے جس کے حوالہ اپنے مال و دولت کو کیا ہے اس کو اپنا امین اور نائب بنایا ہے کہ وہ اس کی طرف سے امور خیر میں اس کو صرف کرے، میں نے جو اصول اوپر پیش کیا ہے، اس

صاف ظاہر ہے کہ یہاں دوسرے معنی صحیح ہیں، کشاف، بیضاوی اور روح المعانی وغیرہ میں بھی اسی معنی کو مقدم رکھا ہے، کشاف میں ہے :

ان الا موال التي فی ایدیکم
اتماهی اموال اللہ بخلقہ وانشاءہ
لہا و اتما موالکم ایاہا و خولکم
للاستمتاع بہا، وجعلکم خلفاء فی
التصرف فیہا۔

بیضاوی میں ہے :

من الا موال التي جعلکم اللہ خلفاء
فی التصرف فیہا

روح المعانی میں ہے :

جعلکم سبحاء خلفاء عنہ عزوجل
فی التصرف فیہ من غیہ ان
تسلکوا حقیقۃ۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان مفسرین کے نزدیک اموال کی ملکیت و حقیقت اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور بنی آدم ان ملکات کے تصرف میں اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اس کے وکیل و نائب ہیں۔

اب ہم اصل آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں جو اس باب کا سرعنوان ہے، یعنی

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ
فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (بقرة: ۳۱)

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے تعیم کے ساتھ انہی سابقہ دونوں معنوں کو یکے بعد دیگرے لکھ دیا ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے طبری میں یہ دونوں قول ہیں، ایک یہ کہ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کی جانشینی کا ذکر ہے، دوسرا یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ اپنی نیابت کا ذکر فرما رہا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت

عبداللہ بن عباس کی روایت کے حوالہ سے لکھا ہے،

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً مِّنِّي
يَخْلُقُنِي فِي الْحَمْرِ بَيْنَ خَلْقِي۔

اس کے اوپر ابن زید کی تفسیر کا مطلب یہ بیان کیا ہے :

ان اللہ تعالیٰ اخبر الملائکۃ انہ جاعل
فی الارض خلیفۃ لہ یحکم فیہا بین

اللہ تعالیٰ فرشتوں کو خبر دے رہا ہے کہ وہ زمین میں
اپنا ایک خلیفہ بنا رہا ہے جو اس کے حکم کے مطابق اس کو

مخلوقات میں فیصلہ یا حکومت کرے گا۔

خلقہ بحکمہ (ص ۱۰۳ امر)

اس سلسلہ میں قاضی بیضاوی کی تصریح زیادہ حکیمانہ ہے :

والمراد به آدم عليه السلام لأنه
كان خليفة الله تعالى في أرضه
وذلك كل نبى استخلفهم في عمارة
الأرض وياسة الناس وتكميل نفوسهم
وتنفيذ أمرهم فيهم لا حاجة به تعالى
إلى من ينوبه بل لقصور قبضه وقلقى أمره
بغير وسط۔
اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں، کیونکہ وہ اس کے
زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے اور اس طرح اللہ تعالیٰ
نے ہر نبی کو خلیفہ بنایا زمین کی آبادی اور لوگوں کے
نگرانی اور نفوس کی تکمیل اور اللہ تعالیٰ کے
احکام نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ اس کا محتاج نہیں
کہ کوئی اس کا خلیفہ ہو، بلکہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ
کے احکام کی تلقین کسی واسطہ کے بغیر ممکن نہ تھی۔

لیکن قرآن پاک کی آیتوں سے جو ابھی اوپر گزری ہیں اور جن میں اللہ تعالیٰ نے سارے بنی آدم کو
خلفاء فرمایا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے توسط سے اس خلافت الہی کی سندان کے متبوعین
تک کو عطا ہوئی ہے، اور سارے بنی آدم اس شرف سے ممتاز ہیں۔

آیت میں خلافت کی جو تفسیر بھی بیان ہوئی ہے اس کی ترجیح کے حسب ذیل اسباب ہیں۔

۱۔ تمام مفسرین نے شروع سے اس مطلب کو لکھا ہے۔

۲۔ روایات سے اور قرآن پاک کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ ایک مخلوق کے بعد
دوسری مخلوق کو پیدا کرتا رہا، اس لحاظ سے آدم کی تخلیق کوئی نئی بات نہ تھی، لیکن جس اہتمام سے جس شان
سے اور جس اہمیت سے حضرت آدم کی پیدائش، اللہ کی نیابت، فرشتوں کے سجدہ کرنے اور جنت کے داخلہ، پھر ان
کی عدول حکمی اور دنیا میں آباد ہونے اور سلسلہ انبیاء و قائم کرنے وغیرہ کے خصوصیات و فضائل جو بیان کئے گئے
ہیں ان سے پہلے کی مخلوقات میں کوئی ممتاز نہیں ہوا، یہ اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ نیابت گذشتہ مخلوق کی
نہیں، بلکہ خالق کی تھی۔

۳۔ اوپر تفصیل سے تمام آیتوں کو لکھ کر جو اصول مہد کیا گیا ہے، اور جس کا منشا یہ ہے کہ متکلم کے جس کلام
میں نیابت کی توضیح مذکور ہوگی، اس میں اسی مذکور کی نیابت سمجھی جائے گی، اور جو کلام اس توضیح سے خالی
ہوگا وہ لامحالہ اسی متکلم کی نیابت مراد ہوگی، جیسے کسی بادشاہ نے کہا کہ میں نے زید کو نائب بنایا، اب اگر
کلام میں اس کی توضیح مذکور ہے، یا سیاق و سباق سے مفہوم ہوتا ہے کہ کس کا نائب بنانا مقصود ہے تو اسی کی نیابت
سمجھی جائے گی، اور اگر اس توضیح سے کلام کلیہً خالی ہے تو مقصود خود بادشاہ کا اپنا نائب بنانا ہے، اس اصول
پر ظاہر ہے کہ اس آیت میں اور نہ اس سے آگے اور نہ اس کے پیچھے کسی ایسے شخص کی توضیح ہے، جس کا
آدم کو نائب بنانا سمجھا جائے، ایسی حالت میں بلاشبہ خود اپنا نائب بنانا مقصود ہو جائے گا۔

۴۔ اس معنی کی تائید میں اور بھی آیتیں ہیں جس سے آدم اور بنی آدم کے شرف و کرامت کا

انہما ہوتا ہے، فرمایا :

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَا هُمْ
فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنْ
الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ
خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (بنی اسرائیل : ۷۰)

دوسری آیت میں فرمایا :

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ
تَقْوِيمٍ (رحمن : ۱۵)

ہم نے آدم کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور ان
کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں، اور ان کو
پاک چیزیں روزی کیں، اور ہم نے ان کو اپنے
بہتری مخلوقات پر بزرگی دی۔

ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا
کیا ہے۔

پھر آسمان سے لیکر زمین تک جو کچھ ہے سب اس کے لیے بنا ہے، اور سب اس کے کام میں لگے ہیں :
اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں، اور جتنی چیزیں زمین
میں ہیں، ان سب کو اپنی شرف سے مسخر بنایا ہے،
نیک اس میں ان لوگوں کے لیے دلائل ہیں جو سچے ہیں۔

اور یہی نیابت الہی کی حقیقت ہے، قرآن میں ایک جگہ نہیں، بیسیوں مقامات میں تمام مخلوقات
الہی کو انسان کا نائب اور مسخر اور اسی کے لیے ان کا پیدا کیا جانا بہ تفصیل مذکور ہے، مزید تشریح
کے لیے چند آیتیں اور لکھی جاتی ہیں :

وَخَلَقْنَاكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ
جَمِيعًا (بقرة : ۳۰)

اور اس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے
لیے پیدا کیا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ دَنَلًا : (۲)

اور وہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے اختیار میں کیا۔

اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ دَجَائِلًا : (۱)

اللہ ہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے قابو میں کر دیا۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ (ابراہیم : ۵)

اور کشتیوں (جہازوں) کو تمہارے زیر فرمان کر دیا۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ (ابراہیم : ۵)

اور نہروں کو بھی تمہارے زیر فرمان کیا۔

ان آیات سے ثابت ہے کہ انسان اس کائنات کا مقصود اصلی ہے، اور اسی کو ساری مخلوقات کی مٹاری
بخشی گئی ہے، اور یہی خلافت الہی کا منشا ہے، ایک اور آیت میں ارشاد ہے :

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ
وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا
وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ
ظَلُومًا جَاهِلُونَ (احزاب : ۷۲)

ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں
پر پیش کیا، تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا
اور اس سے ڈر گئے، اور انسان نے اس کو اٹھا
لیا، بیشک وہ ظالم اور جاہل تھا۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ ساری مخلوقات میں سے امانت و نیابت الہی کے بار کا اٹھانے والا انسان

ہی ہے یہ امانت الہی کیا ہے، یہ اسی نیابت و خلافت کے بیان کا دوسرا پیرا ہے، ناٹھ حقیقت میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کی طرف سے صرف ایک وکیل اور امین کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ صرف مالک کی امانت ہے، جو اس کو ملی ہے، تاکہ نیابت کے فرض سے عمدہ برآ ہو سکے اس کا علم اور اس کے دوسرے کمالات و محاسن و اوصاف سب اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہیں اور اسی کے خزانے سے اس کو چند روز کے لیے عاریت ملے ہیں، یہ حدیث کہ فَاتَ اللَّهُ خَلْقَ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ دَاوُدَ تَعَالَى نَعَمْ آدَمَ كَوْنِ صُورَتِهِ پَرِیْدَ اِیْلَہِ، اسی معنی کی طرف مشیر ہے اور مشہور قول تَخْلُقُوا بِاخْلَاقِ اللَّهِ دَاوُدَ تَعَالَى اَخْلَاقُ سَبِّحُہُ کی تشریح بھی یہی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہو گا کہ اسلام کا نظریہ سلطنت و ریاست ایک ایسے تصور پر مبنی ہے، جو انسانیت کو بلند سے بلند نقطہ تک پہنچاتا ہے، اور جس کے اندر مادی و روحانی سیاسی اور اخلاقی دنیاوی اور دینی دونوں تصورات باہم دست و گریباں ہیں۔

اب اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ خلق عالم کا مقصود اور مخلوقات کا سردار اپنے اصل مالک کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت اور عظمیٰ کا اقرار کرے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی عزت بتا دی ہے، وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ میں نے انسان اور جن کو اسی لیے بنایا کہ وہ میری بندگی کریں، اس کی حیثیت اس ایجنٹ کی ہے جس کا فرض صرف اپنے مالک کے احکام کی تنفیذ ہے، اس کے ہاتھ میں شریعت الہی کا فرمان ہے، اس کے احکام کو خود بجالانا اور ساری دنیا کو اس کے بجالانے پر آمادہ کرنا اس کا سب سے بڑا فرض ہے، وہ صرف اپنے مالک کی مرضی کا تابع اور اس کے حکم کا بندہ ہے۔

امت مسلمہ کی بعثت

عقیدہ خلافت کی رو سے اگرچہ سارے بنی آدم اس نیابت الہی کے شرف کے مستحق ہیں، مگر اہل سعادت وہی ہیں جو اس کو مانتے، اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کا ذمہ دار جانتے اور نیابت کی بلندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی اور سرفرازی کو تسلیم کرتے ہیں، اس نیابت اور عبودیت کے اصل نمائندے تو انبیاء علیہم السلام ہیں، مگر ان کی تبعیت میں ان کی امتیں بھی شامل رہی ہیں، لیکن اب جبکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لیے خاتم الانبیاء ہو کر تشریف لائے ہیں اور آپ کے بعد اب کوئی دوسرا نبی قیامت تک آنے والا نہیں ہے، تو امت محمدیہ بھی اپنے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ و التسلیم کی تبعیت میں نیابت الہی کی نمائندہ ہے اور دنیا کی آخری امت کی حیثیت سے قیامت تک نمائندہ رہے گا، اسی لیے قرآن پاک اور احادیث نبوی میں اس کا لقب خاتم الامم اور آخر الامم ہے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو آخرین کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جیسے معنی پچھلوں میں ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْاَوَّلَیْنِ وَثَلَاثَةٌ مِّنَ الْاٰخِرَیْنِ (واقعه ۱۰) ایک چھوٹا گروہ اگلوں میں اور ایک چھوٹا گروہ پچھلوں میں سے۔

اور ان سے پچھلوں میں جو ابھی تک ان میں شامل نہیں ہوئے۔ وَ اٰخِرَیْنِ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ (جمعہ ۱) اس سے معلوم ہوا کہ امت محمدیہ کے بعد کوئی نئی امت پیدا نہ ہوگی کہ کوئی نیا نبی اب قیامت تک نہ آوے گا، احادیث میں بھی اس کی تصریحات موجود ہیں صحیح بخاری میں ہے کہ انبیاء کی ان امتوں کی مثال مزدوروں کی ہے، اللہ تعالیٰ نے پہلے یہود کو مزدوری پر رکھا تو انہوں نے ظہر تک کام کیا، پھر چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ نہ مانے، پھر نصاریٰ کو مزدور مقرر کیا، انہوں نے عصر تک مزدوری کر کے کام چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ کام کرنے پر آمادہ نہ ہوئے، عصر کے بعد مسلمانوں کو مزدوری کا شرف بخشا تو انہوں نے مغرب تک کام کر کے انجام تک پہنچا دیا اور پوری مزدوری پائی (ملخص) یہ حدیث بعض الفاظ کے اختلاف کیساتھ بخاری و ترمذی و موطا و حاکم و غیرہ حدیث کی کئی کتابوں میں ہے (کنز ۴۰-۴۱) اس حدیث میں دن سے مراد زمانہ ہے، اس سے واضح ہے کہ امت مسلمہ دنیا کی آخرین امت ہے صحیح بخاری و مسلم و نسائی میں اوپر کی حدیث کی یہ شرح ہے۔

نَحْنُ الْاَوَّلُونَ وَالْاٰخِرُونَ ہم ہیں سب سے پہلے لوگ اور سب سے آخری یعنی ظہور کے لحاظ سے تو دنیا کی تمام امتوں میں ہم سب سے پہلے ہیں، لیکن ابرو و ثواب میں قیامت کے دن ہم سب کے آگے ہونگے، حدیث کا یہ کٹر استدراک حاکم بیہقی اور نسائی میں بھی ہے (کنز ۶۱-۶۲) صحیح بخاری، کتاب التبعیر ۶

ابن ماجہ ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

ہم سب سے آخری امت ہیں۔

نحن اخوانہ ص ۶۰-۶۱ (کترہ ۲۳۰) ہم سب سے آخری امت ہیں۔
معرض ان آیات اور احادیث سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ امت محمدیہ دنیا کی آخری امت ہے کیونکہ وہ آخری
نبی کی امت ہے۔

اس امت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ چو کہ آخری امت ہے اور نبوت کی آخری امانت کی حامل ہے اس لیے قیامت تک اس میں اہل حق کا ایک گروہ ہمیشہ غالب و منصور رہے گا، جو دنیا پر اللہ تعالیٰ کی شہادت کی مہر لگاتا رہے گا اور اہل عذنب کی حجت کا قاطع ہوگا۔

اس خصوصیت کا ثبوت قرآن پاک اور احادیث میں تصریح کے ساتھ ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ قرآن پاک قیامت تک محفوظ رہے گا۔ اب ظاہر ہے کہ اسکی حفاظت کرنے والے مسلمان ہی ہوں گے، اللہ تعالیٰ کسی بات کا وعدہ فرماتا ہے تو اسکی یہ معنی نہیں کہ وہ وسائط اور تدابیر کے بغیر ہی اسکو پورا کر دینگا، گو اس کی قدرت کی وسعت میں سب کچھ ہے مگر عالم تدبیر میں اس نے اپنے موعودات کے لیے اسبابِ علل کا واسطہ رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے بندوں کی روزی کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کا حصول اسباب اور تدبیر پر موقوف رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے خلافت کا وعدہ فرمایا تو اس کا حصول بھی مجاہدات پر موقوف رکھا، اس کے بعد پورا فرمایا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا ہے، تو وہ بھی اسبابِ تدابیر کے ذریعہ ہی پورا ہوگا، اسی لیے قرآن پاک کی بقائے دوام کے لیے حاملین قرآن کو بھی تاقیامت دوامِ نسخے گا اور انہی کے ہاتھوں اور انہی کے سینوں میں محفوظ رکھ کر اس وعدہ کو پورا فرمائے گا، اور یہ وعدہ بھی اسی وقت اپنے اصلی معنوں میں پورا ہوگا جب امت محمدیہ کا ایک گروہ غلبہ اور سطوت کیساتھ دنیا میں قائم ہے، اِذَا دَالَّتْهُنَّ اُمَمٌ يَمْشِيْنَ وَلَهُنَّ اَمْوَالٌ كَثِيْرَةٌ يَمْشُوْنَ بِهَا حَقِّقًا وَهُمْ يَخْلُقُوْنَ اَمْوَالًا يَمْشُوْنَ بِهَا حَقِّقًا (انعام: ۷۰)

اہل تفسیر نے اس کو امت محمدیہ کے حق میں سمجھا ہے اور ظاہر کیا ہے کہ یہ حال مستقبل دونوں کے لیے ہے، یعنی قیامت تک امت محمدیہ کا ایک گروہ حق کے ساتھ قائم رہے گا بلکہ

قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فُتُوًا لِلَّذِينَ
كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (آل عمران)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصلی منکر تو یہود ہیں، گو دوسرے کفار بھی تبعاً اس میں داخل ہیں، اسی طرح ان کے اصلی پیرو تو مسلمان ہیں، مگر معنی میں یہودیوں کے مقابلہ میں عیسائی بھی پیرو کئے جاسکتے ہیں، گو گمراہ ہوں بہر حال اس آیت سے ظاہر ہے کہ اہل اسلام اور ان کے ساتھ عیسائی بھی قیامت تک دنیا میں قائم رہنے والے ہیں اور

لے تفسیر خازن، تفسیر آیت مذکورہ لے تفسیر ابن جریر، تفسیر آیت مذکورہ لے تفسیر روح المعانی، تفسیر آیت مذکورہ ۛ

عجب نہیں کہ حق و باطل کے یہ دو حریف قیامت تک ہا ہم کشمکش میں مبتلا رہیں، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے مسلمانوں کو غلطہ عام حاصل ہو جائے، جیسا کہ نزولِ مسیح علیہ السلام کی حدیثوں کا منشا بھی ہے۔

قرآن پاک کے ان ارشادات النص کی تصریح احادیث نبوی میں استغاضہ کے درجہ تک ہے :

لا تزال من امتي امة قائمة بامر الله
لو يفرهم من خذلهم ولا من خالفهم
حق يا ايها الامراء الله وهم
على ذلك (بخاری، علامات النبوة)

میری امت کا ایک گروہ خدا کی شریعت کو نیکر قائم رہے گا،
اس کے چھوڑنے والے اور اس کے مخالف اس کا کچھ بگاڑ
کیس گئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی بات یعنی قیامت
آجائے گی اور وہ اسی پر قائم رہیں گے۔

لا يزال ناس من امتي ظاهرين حتى يأتيهم امر الله وهم ظاهرون (بخاری، علائق النبوة)
لا يزال من امتي قوم ظاهرين على الناس حتى يأتيهم امر الله (بخاری، کتاب التوحید)

میری امت کے کچھ لوگ ہمیشہ غالب رہیں گے، یہاں تک کہ خدا کی بات یعنی قیامت آجائے گی۔
میری امت کا ایک گروہ وہ ہمیشہ غالب رہے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

لو یزال من امتی امة قاضة بما صر الله لا یضهم
من کذبهم ولا من خذلهم حتی یأقی صر الله
وهم علی ذلک (بخاری، کتاب التوحید)

میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ احکام الہی کو لیکر قائم رہے
گا اسکے جھٹلانے والے اور اس کے چھوٹنے والے اسکو کچھ
نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

لا تزال طائفة من امتي ظاهرة من علي الحق
لا يضرهم من خذلهم حتى يأتهم امر
الله وهم كذلك (مسلم، کتاب الامارة)

لن يبرح هذا الذين قانمًا يقاتل عليه
عصاة من المسلمين حتى تقوم الساعة
ومسلم برتاب لامة

یہ دین اسلام ہمیشہ قائم رہے گا اس کے لیے
مسلمانوں کی ایک جماعت ہمیشہ لڑتی رہے گی یہاں
تک کہ قیامت آجائے۔

لا تزال طائفة من امتي يقاقلون على الحق
میری امت کا ایک گروہ قیامت تک حق پر رہتا رہے گا۔
اور اپنے دشمنوں پر غالب رہے گا۔

میری امت میں سے کچھ لوگ ہمیشہ احکامِ الہی کو لے کر قائم رہیں گے، ان کو چھوڑنے والے اور مخالف کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

ولم تزل عصاة من المسلمين يقاتلون على الحق ظاهرين على من فاداهم الى يوم القيامة
(مسلم، کتاب الامارہ) مسلمانوں کی ایک جماعت حق پر ہمیشہ لڑتی رہے گی، اور قیامت تک اپنے دشمنوں پر غالب رہے گی۔

لا تزال عصاة من امتی
یقفلون علی امر اللہ قاہرین لدوہم
لا یضرہم من خالفہم حتی
یأتیہم الساعة وہم علی ذلک مسلم بناب لا مارہ
یہ حدیثیں صرف صحیحین کی ہیں، حدیث کی دوسری کتابوں میں جیسے مستدرک حاکم، جامع ترمذی، سنن نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن حبان میں بھی اس معنی کی حدیثیں مذکور ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری تسکین کی خاطر کے لیے کس شدت اور کس وضاحت کے ساتھ یہ پیشین گوئی فرمادی ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اپنے ظاہری و باطنی غلبہ اور قوت کے ساتھ قیامت تک قائم رہے گا تاکہ حق کا پیغام قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آئندہ کسی جدید نبی کی بخت نہ ہوگی اور یہ فرض جو پہلے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ عطا ہوتا تھا، وہ ہر دور میں مسلمانوں کی ایک جماعت انجام دے گی، ایک حدیث ہے العلماء و رثة الانبیاء، یعنی امت محمدی کے علماء انبیاء کے وارث ہیں، ظاہر ہے کہ یہ وراثت نبوت کے عہدہ اور منصب میں نہیں ہے کہ یہ خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس پر ختم ہو گیا، بلکہ نبوت کے فضائل کمالات و فضائل فیہ سے ان کے حسب استعداد و مرتبہ حصہ ملے گا، اور وہ تبلیغ دین، ہدایت خلق، دعوت حق، اقامت دین، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دفع شہات، ابطال مبطلین اور رد بدعات وغیرہ ہیں۔ اور وہ یہی کام انجام دیں گے۔

علمائے امت کے علاوہ صلحائے امت بھی یہی درجہ رکھتے ہیں، چنانچہ ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے ساری امتوں کے سرے قیامت کی پہلی مصیبت دور ہوگی، تو یہ امتیں بیک زبانہ امت محمدیہ کے متعلق یہ شہادت دیں گی۔

کادت هذه الامة ان تكون انبياء كلها (مسند طرابلسی، ص ۳۵۴، عن ابن عباس و مسند احمد و ابویعلی) قریب ہے کہ اس امت کے سارے افراد انبیاء کا مرتبہ پائیں۔

ایک حدیث میں اس کی تشریح آئی ہے کہ اس امت کو یہ رتبہ اس طرح حاصل ہوا کہ شہداء علی الامۃ یعنی اپنی اپنی امت پر شاہد ہونے کا مرتبہ جس طرح انبیاء نے کرام صلوٰۃ اللہ علیہم کو حاصل ہوا اسی طرح اس امت کو شہداء علی الناس کا مرتبہ عنایت ہوا ہے، صحیح احادیث میں ہے کہ قیامت کے دن ساری امتوں پر شہاد کا کام امت محمدیہ سے لیا جائے گا، یہ شاید اس لیے ہوگا کہ امت محمدیہ ہی وہ امت

لہ دیکھئے کنز العمال ۱۶ ص ۲۳۱، ۲۳۵۔ یہ حدیث مسند احمد اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بطریق متعدد مروی ہے، اور محدثین نے اس یساس کو معتبر مانا ہے، دیکھئے مقاصد حسنہ سخاوی و کشف الخفاء و عجولنی، (دقیقہ بر صغیر آئندہ)

ہے جو سارے پیغمبروں کی صداقت پر ایمان لائی ہے حضرت عبادہ بن مسعود سے حکیم ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے: اس امت کو ایسی باتیں ملی ہیں جو کسی کو نہیں ملیں، انہیں سے ایک یہ کہ اس امت سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَدْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (مومن ۶۰) مجھے پکارو، میں تمہیں جواب دوں گا، یا مجھے مانگوں، دعا قبول کروں گا۔

حالانکہ یہ مرتبہ پہلے صرف انبیاء کو حاصل تھا، اور دوسری یہ کہ ان سے کہا گیا: وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ اللہ تعالیٰ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی۔ اور یہ بھی صرف انبیاء کو کہا گیا تھا، اور تیسری یہ کہ ان سے کہا گیا: وَ كَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ۔ ہم نے تم کو بیچ کی امت یا شریف و معزز امت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر شاہد ہو۔

یہ بھی پہلے صرف نبیوں سے کہا گیا تھا کہ تم اپنی امت پر شاہد ہو۔ اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اس روایت میں امت محمدیہ کی جو پیغمبرانہ فضیلتیں بیان کی گئی ہیں وہ درحقیقت قرآنی آیتوں سے مؤید ہیں، قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں یہ مضمون دہرایا گیا ہے کہ امت محمدیہ کو شہادۃ علی الناس اور شہادۃ علی الامم کی فضیلت بخشی گئی ہے۔

۱۔ شہید اور شاہد کے لغوی معنی حاضر، کے ہیں، کسی شخص کا کسی شخص کے پاس حاضر ہونا یا حاضر رہنا مختلف اغراض سے ہو سکتا ہے، مثلاً اس کی حمایت اور مدد کے لیے، اس کی ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے کے لیے اسکی دیکھ بھال اور نگرانی کے لیے اس کے متعلق کسی واقعہ کی گواہی اور اس کے دعوئی کی تائید کے لیے، اس کو امور خیر کی تعلیم اور شر سے بچانے کے لیے اسی لیے لغت کے اصول سے لفظ شہید اور شاہد ان لغوی معنوں میں حسب سیاق و سباق بولا جاتا ہے، جس کا اندازہ حسب ذیل آیتوں سے ہوگا:

۱۔ حمایتی اور مددگار کے معنی میں: وَ اَدْعُوْا شُهَدَاءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (بقرہ: ۱۹۳) اور اللہ کے سوا اپنے حامیوں کو بلاؤ (قرآن کا جواب لائیں)

اس معنی کی تائید ایک دوسری آیت سے ہوتی ہے: وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا (بنی اسرائیل: ۱۰) اگرچہ اس قرآن کے جواب لانے میں، یہ لوگ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔

۲۔ ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے والے کے معنی میں: اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (ج: ۲) اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

دقیقہ حاشیہ صفحہ سابقہ ص ۶۴ تا حافظ ابن کثیر نے قرآن کے دوسرے پارہ میں لکھوا شہداء علی الناس کی تفسیر میں ان روایتوں کو یکجا کر دیا ہے:

ان معنی کی آیتیں قرآن پاک میں کئی ہیں

۳۔ کسی کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے والے کے معنی میں :

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ دَمَائِدَهُ (۱۲۱)

حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں : میں اپنی امت پر جب تک ان میں رہا، نگران رہا۔

۴۔ گواہ اور دعویٰ کی تائید کرنے والے کے معنی میں :

فَلْيَنْفِ إِذَا جُنَّا مِنْ كُلِّ أَقْبَةٍ بِشَهِيدٍ وَجُنَّا بِكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدًا (نساء ۶۱)

بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے گواہ کو بلائیں گے اور تم کو ان لوگوں کا دھال بنانے کو گواہ طلب کریں گے۔

۵۔ امور خیر کی تعلیم، یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنیوالے کے معنی میں :

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (بقرہ ۱۴۳)

اور اسی طرح تم کو معتدل امت بنایا تاکہ تم لوگوں کے بنانے والے ہو، اور یہ رسول تمہارا بتانے والا ہو۔

اسی معنی کی تائید قرآن کی دوسری آیت سے ہوتی ہے :

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَامِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَیُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران ۱۱۰)

قوموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں ان سب میں تم بہتر ہو، اچھی باتوں کو بتاتے ہو، اور بری باتوں سے روکتے ہو۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ امت محمدیہ جو آخری امت ہے، اس لیے جبعوت کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آخری شاہد کے طور پر اس دنیا میں پیغمبروں کے کاموں کو انجام دے وہ نبی کے دعویٰ کی شاہد حمایتی، مددگار اور گواہ ہے وہ دنیا کی ساری قوموں کی نگران کار بنا کر بھیجی گئی ہے، اسکا فرض ہے کہ وہ قیامت تک قوموں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے، اب نبیوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا کہ دین الہی کامل ہو چکا پیغام الہی کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے، اور اس کی تبلیغ اور اشاعت کا فرض امت محمدیہ کے سپرد ہو گیا ہے، اب یہ تنہا اس کے ذمہ ہے کہ قیامت تک تمام دنیا میں کلمہ الہی کی بلندی، حق کی اشاعت، دین کی تبلیغ، نظام عدل کی برقراری اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دے۔ رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے امام و پیشوا ہیں وہ خود ساری امتوں کی پیشوا و امام ہے، اور اس کا فرض ہے کہ وہ ان کی امامت اور پیشوائی کرے، چنانچہ قیامت کے دن اس کی یہی فضیلت تمام انبیاء کی امتوں پر شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگی، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن حضرت نوحؑ بلانے جائیں گے، وہ حاضر ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نے اپنی امت کو تبلیغ کی تھی وہ عرض کریں گے ہاں! میرے رب، پھر اللہ تعالیٰ ان کی امت سے پوچھے گا کہ کیا

انہوں نے تم کو تبلیغ کی، وہ انکار کریں گے کہ میرے پاس تو کوئی ڈر نہ لے والا نہیں آیا، تب اللہ تعالیٰ نوحؑ سے پوچھے گا تمہارے دعویٰ کی شہادت کون دیتا ہے؟ وہ عرض کریں گے محمد اور انکی امت، تو یہ نوحؑ کی شہادت دیں گے۔ یہ ارشاد فرما کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا (یعنی تم کو معتدل و عادل امت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہو) صحیح بخاری تفسیر سورہ بقرہ۔

حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تفسیر میں مسناد و مستند حاکم وغیرہ سے اور متعدد حدیثیں نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا نام یہاں مثلاً ہے، ورنہ امت محمدیہ کی یہ شہادت دنیا کی ساری امتوں پر ہوگی، اس کا سبب ظاہر ہے کہ دنیا میں یہی ایک امت ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام ان کی کتابوں کی صداقت کی شاہد ہے، اس شہادت کے بغیر کوئی شخص اس امت میں داخل ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ ان کے ایمان کا جزو ہے یہی ایمان جو شہادت کے ہم معنی ہے، قیامت میں نبیوں کی صداقت کی تائید میں ان کی امتوں کے مقابلہ میں شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

سورہ حج میں سورہ بقرہ کی اس آیت کی مزید تائید ہے :

هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا يَكُونُ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (حج ۱۰ آخر)

اسی اللہ نے (اسے امت محمدیہ) تم کو (ساری امتوں) میں چنا ہے، اور اللہ نے تمہارے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی، تمہارا باپ ابراہیم کا دین، اسی نے تمہارا نام مسلم پلے رکھا، اور اس قرآن میں بھی تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر۔

ادھر کی تین آیتوں میں امت محمدیہ کے تین وصف بیان ہوئے ہیں، اُمَّةً وَسَطًا، (عادل و معتدل امت) خَيْرَ أُمَّةٍ (سب سے بہتر امت) هُوَ اجْتَبَاكُمْ (تم کو خدائے چنا ہے) یہ تینوں وصف اس امت کی برگزیدگی برتری، اور فضیلت پر شاہد ہیں، بلکہ وصف اجتباکم (تم کو چنا اور برگزیدہ کیا) تو ایسا ہے کہ اس کا اطلاق انبیاء علیہم السلام پر کیا گیا ہے۔

اس امت محمدیہ کی ساری امتوں پر شہادت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس امت کے شاہد عادل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جو قیامت تک کے لیے آخری نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں، اس لیے دنیا کی ساری امتیں خواہ وہ اپنے کو کسی بھی سابق نبی کی طرف منسوب کریں، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دعوت ہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں دعوت کے اس فرض کو انجام دیا، آپ کے بعد عہد نبوت قیامت تک اس پیغام الہی کی دعوت و تبلیغ امت محمدیہ کا فرض قرار پایا، جب تک دنیا آباد ہے، ہر ملک میں، ہر قوم میں، دنیا کے ہر گوشے میں اس پیغام الہی کی دعوت و تبلیغ تا بر قیامت امت محمدیہ کا فرض ہے، یہی بعض علمائے محققین کی اصطلاح میں امت محمدیہ کی بعثت ہے، جس کی تعبیر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے حسب ذیل فرمائی ہے :

شاہ صاحب کا منشا یہ ہے کہ نبی کی بعثت اولیٰ اس کی قوم کی اصلاح اور تزکیہ کے بعد اس کو اس نبی کے احکام و تعلیمات و آداب کا سراپا نمونہ بنا دیتی ہے، اور پھر وہ قوم اپنے نبی کا پیغام لیکر جو اس کو پہنچا ہے، دنیا کی دوسری قوموں میں پھیل جاتی ہے اور اس سے دنیا کی دوسری قومیں ہدایت پا کر اور قوموں کی طرف مبعوث ہوتی ہیں، اور اسی طرح یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نبی کی بعثتِ اولیٰ کی خبر تو اس آیت میں ہے :
هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ (جمعه : ۱۰)
وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول ان
ہی کے اندر سے بھیجا۔

اور امت کی بعثت کا بیان اس آیت میں ہے :

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: ۱۰۴) قوموں کی رہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں ان سب میں تم بہتر ہو۔

اور حدیث صحیح میں اس بعثت کی تصریح ان الفاظ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا :

فَانْصَابِعْثُكُمْ مُبْسِرِينَ وَلَمْ تَبْعُوا مُخْبِرِينَ۔

تم لوگ آسانی پیدا کر نیوالے بنا کر بھیجے گئے ہو، اور دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ امت محمدیہ ایک پیغام حق کی حامل ہے، اور اپنے رسول کی طرف سے عوت تبلیغ پر مامور ہے، وہ اس لیے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی اصلاح و تزکیہ کی خدمت انجام دے، اور اپنے نبی کے پیغام کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلائے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع میں خیر حکم: تبلیغ الشاہد الغائب (میرے پیغام کو جو یہاں موجود ہے وہ اس تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں)۔

مصرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک کے لیے محدود نہیں، بلکہ قیامت تک کے لیے جاری ساری ہے، فرمایا گیا کہ ہر حاضر دوسرے غیر حاضر کو اسی طرح پہنچاتا چلا جائے، ذیل کی آیت پاک بھی یہی منشا ہے،
 وَلَوْ نَفَرْنَا مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لَفَقَعْنَا فِي السَّمَاءِ النَّارَ وَلَئِنِذُرُّوهُمْ إِذَا جَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ
 سَدُّوْنَ (توبہ: ۱۵)

تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تاکہ دین کا علم سیکھتے، اور اس میں سمجھ پیدا کرتے اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ان کو ڈر سنا تے تاکہ وہ حذر کرتے۔

کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ
قَاهِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ
الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ دَالِ عِمْرَانِ (۱۲)

قوموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں ان سب میں تم بہتر
ہو، اچھی باتوں کو بتاتے ہو، اور بُری باتوں کو روکتے
ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

لیکن اس سے معلوم ہوا کہ امت کا یہ مشرف اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ترک نہ کرے اور ایمان باللہ سے محروم نہ ہو جائے بلکہ ایمان باللہ سے معمور ہو کر خیر کی اشاعت اور شر کی ممانعت کیلئے سر فروشی کرے، اور اسی لیے اس سے چند آیت پہلے یہ حکم بھی وارد ہے :

وَلَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (آل عمران: ۱۱۰)

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلانے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور بُرے کاموں سے منع کرے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ امت محمدیہ کی فلاح اس امر معروف اور نہی منکر اور دعوت و تبلیغ میں مضمر تھی، جس سے ہر دور میں نئی نئی قومیں اسلام کی آغوش میں اپنا یا خون لیکر آئیں اور اسلام کی صولت و شوکت کو مسلسل قیام و بقا بخشتی رہیں، لیکن جب سے مسلمانوں نے امت کو قوم کے معنی میں سمجھ لیا، امت بانجھ ہو گئی اور دوسری قوموں کا داخلہ اس میں بند ہو گیا، مگر انشاء اللہ یہ وعدہ الہی پورا ہو کر رہے گا کہ اگر ایک قوم اپنے فرض سے غافل رہے گی تو دوسری قوم آکر اس فرض کو ادا کرے گی۔

اَلَا تَنْفُرُوْا يُعَذِّبُكُمْ عَذَابًا
اَلِيْمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ
وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا

(توبہ: ۶۷)

پھر فرمایا :
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ
عَنْ دِينِهِ فَمَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِسَعْتِهِ
يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ
وَأَعِزَّةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَلِكَ فَضْلُ
اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ (مائدہ : ۸)

معلوم ہوا کہ نئی جگہ لینے والی قوم کی صفیتیں یہ ہوں گی، اللہ تعالیٰ اس سے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھے گی، اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرے گی، کفار کے مقابلہ میں سخت ہوگی،

کی راہ میں جہاد کے لیے ہمیشہ آمادہ رہے گی، اظہار حق میں کسی ملامت کی پروا نہ کرے گی۔
اس بعثت سے مشرف اور قوموں کی شاہد بن کر آنے والی امت کے آثار اور فرائض کی پوری تفصیل

سورہ حج کے آخر کی آیتوں میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا
وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ
تُغْلِبُونَ ۚ وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ
جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَكُمْ وَما جَعَلَ
عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ
مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّاكُمُ
الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا لِيَكُونَ
الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا
شُهُدَاءَ عَلَى النَّاسِ فَأَقِيمُوا
الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا
بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَى
وَنِعْمَ النَّصِيرُ ۝ (حج ۱۰۱)

مومنو! رکوع کرتے اور سجدہ کرتے اور اپنے پروردگار
کی عبادت کرتے رہو، اور نیک کام کرو تاکہ فلاح پاؤ
اور خدا کی راہ میں جہاد کرو، جیسا جہاد کرنے کا حق
ہے، اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور تم پر دین
دکی کسی بات میں تنگی نہیں کی اور تمہارے لیے تمہارا
باپ ابراہیم کا دین (پسند کیا) اسی سے پہلے (یعنی پہلی
کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان رکھا تھا، اور اس
کتاب میں بھی وہی نام رکھا ہے، تاکہ پیغمبر تمہارے
بانے میں شاہد ہوں اور تم لوگوں کے مقابلہ میں
شاہد ہو اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور خدا کے
(دین کی رسی) کو پکڑے رہو، وہی تمہارا دوست
ہے اور خوب دوست اور خوب مددگار ہے۔

اس آیتوں سے اس شاہد اہم اور مجتہد عالم امت کے حسب ذیل آثار و علامات ہیں :
(۱) اداۓ نماز کی سختی سے پابندی کرنے والی (۲) اداۓ زکوٰۃ پر عامل (۳) ایمان باللہ اور
توکل علی اللہ سے پوری طرح مضبوط (۴) رکوع و سجود و عبادات الہی کی خوشگزر (۵) امور خیر پر حریص (۶)
راہ حق میں جہاد اور فداکاری پر آمادہ رہنے والی۔

امت محمدیہ کے جس گمراہ میں یہ علامات پائی جائیں گی وہی انشاء اللہ تعالیٰ ان پیشین گوئیوں کا
مصدق ہوگا، جو اس کی بقاء اور قیام اور غلبہ و شوکت کے متعلق اوپر بیان ہوئی ہیں اور اسی سے
حق تعالیٰ کا وعدہ ہے۔

قوتِ عاملہ یا قوتِ آمرہ

کسی جماعت کو منظم جماعت بنانے اور اس کی حفاظت کے لیے کسی قانون کو چلانے اور پھیلانے کے
لیے ایک قوتِ عاملہ یا قوتِ آمرہ کی ضرورت فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے، اسی لیے جب سے انسانیت کی تاریخ معلوم
ہے، کوئی ایسی جماعت نہیں بتائی جاسکتی جو کسی سردار کے بغیر وجود میں آئی ہو، انسانی گروہ جب محض ایک
خاندان تھا تو خاندان کا بڑا اس کا سردار تھا، اور اس کی زبان کا ہر حکم قانون تھا، جب خاندان نے جماعت
کا روپ بھرتو جماعت کا چودھری اس کا حاکم و آمر بنا، پھر جماعت نے آگے بڑھ کر قوم کی صورت اختیار
کی، تو بادشاہوں اور راجاؤں نے جنم لیا، ان بادشاہوں اور راجاؤں نے اس عزت اور شرف کو اپنی خدمت
گزاری کا صلہ سمجھنے کے لیے اپنے غرور و استکبار سے اپنا خاندانی حق سمجھ لیا مافوق بشر قوی سے اپنے کو متصف
قرار دیا، اس خیال کا لازمی نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنے دیوتاؤں کی اولاد ظاہر کیا، جن کی پوجا ان کی رعایا پر فسر
تھی، ان میں سے کوئی سورج بنی بنی بنا اور کوئی چندر بنی، یعنی کوئی سورج دیوتا کا نور نظر تھا اور کوئی
چاند کا کھڑا، اور دیوتاؤں کے اوتار اور قوتِ ربانی کے اوتار تو سب ہی تھے۔

عراق کے مزود جبار بن گئے تھے، اور مصر کے فرعون اپنے کورع یعنی سورج دیوتا کے اوتار کہتے
تھے ان ہی میں ایک فرعون وہ تھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اُنارِ بگڑاؤا (۱) اُنارِ
دیں ہوں تمہارا سب سے بڑا دیوتا بننے کا دعویٰ کیا تھا، چین کے بادشاہ اپنے کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، اسی
لیے ایرانیوں نے اپنی زبان میں ان کو بھنور (خدا کا بیٹا) اور عربوں نے ابوس ماء السماء (آسمان
کے نقطہ کا پیدائش کا خطاب دے رکھا تھا، یونان کی قدیم تاریخ بھی ایسے بادشاہوں سے خالی نہیں
جو اپنے کو خدا کا اوتار کہتے تھے، ہومر کے بادشاہ (مونارک) دیوتاؤں کی اولاد تھے اور ان ہی سے
یونان کے سلاطین پیدا ہوئے۔ اس روشنی کے زمانہ میں بھی اس زمین میں جو سورج کا مطلع کھلاتی ہے
یعنی جاپان میں یہ اندھیرا چھایا ہے کہ لوگوں کا بادشاہ جاپانی قوم کا خدا ہے جس کی وہ پوجا کرتی ہے۔

روما کا بانی رومس اور اس کا بھائی دونوں ستارہ مرتج کی اولاد تھے۔ ولادت مسیح کے پہلے
سے سلاطین روم عوام کی نگاہوں میں دیوتا سمجھے جاتے تھے، اور ان کی پرستش کی جاتی تھی۔ یہودیوں میں
حضرت داؤد علیہ السلام سے پہلے قاصیوں کی حکومت تھی جو خدا کے کاہن اور خدا سے الہام پا کر خدا کے نام پر
حکومت کرتے تھے، اس کے بعد زمانہ کی گردش اور حالات کے تقاضے سے مختلف قسم کی حکومتیں دنیا میں
قائم ہوتی رہیں، ان ہی سب کے پیش نظر ارباب تاریخ اور علمائے سیاست نے حکومت کی متعدد قسمیں

۱۔ اناسیکلو پیڈیا برٹانیکا، طبع یازدہم، مضمون یونان کے تاریخ روماس ۳، مارالترجمہ جدید آبادکن کے ایضاً ص ۴۲۹

قرار دی ہیں، مثلاً اوتاری، شخصی، زعمی، امرائی، دستوری، جمہوری۔

۱۔ اوتاری سے مفہوم ہوتا ہے، یعنی وہ حکومت جس میں صاحب حکومت کوئی ایسا شخص ہو جو خود خدایا خدا کا منظر یا اوتار یا نائب بن کر حکومت کرتا ہو اور اس کی رعایا بھی اس کو اسی نظر سے دیکھتی اور اسی عقیدت سے اس کو مانتی ہے۔

۲۔ شخصی وہ حکومت ہے جس میں تنہا ایک شخص صرف اپنی ذاتی طاقت یا خاندانی قوت و اثر سے حکومت کرتا ہو اس کی خواہش اس کا قانون اور اس کی زبان اس کا فرمان ہو، دنیا میں اکبر بادشاہ ایسے ہی گذرے ہیں۔

۳۔ اور اگر ملک کے باوقار اور دولت مند افراد مل کر ملک پر حکمرانی کریں تو یہ امرائی حکومت ہے، جیسی کبھی یونان میں تھی۔

۴۔ اگر کوئی شخص اپنی سیاسی طاقت اور وضع قانون کی قوت کو اپنی قوم کے منتخب افراد کے ہاتھ میں دیکر خود کو صرف ظاہری بادشاہ کی حد تک محدود کر دے تو یہ حکومت دستوری ہے جس طرح انگلستان میں ہے کہ وہاں بادشاہ کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

۵۔ زعمی دآمرانہ وہ طرز حکومت ہے جس میں کوئی بھی شخص اپنی ذاتی طاقت سے یا کسی جماعت کا رکن اور روح رواں بن کر اس کے نمائندے کی حیثیت سے ملک پر حکمران ہوتا ہے، مثلاً جرمنی میں ہٹلر، اٹلی میں موسولینی، گو وہ بادشاہ نہیں تھے، مگر ان کا حکم بادشاہ ہی کے طور پر مانا جاتا تھا، فرق اتنا تھا کہ یہ کسی خاندان کے نہیں بلکہ جماعت کے نمائندہ تھے۔

۶۔ اور اگر ملک کے ہر طبقہ کے افراد مل کر خود اپنے لیے کسی مدت معینہ کے لیے اپنا ایک رئیس منتخب کر لیں، جو خاص قواعد کے ماتحت حکومت کرے تو یہ جمہوری ہے، اس کی ایک صورت وہ ہے جو فرانس میں ہے۔ اور دوسری وہ جو امریکہ میں ہے، فرانس کی جمہوریت کا رئیس اسی طرح کم اختیار رکھتا ہے، جس طرح انگلستان کا بادشاہ کم اختیار رکھتا ہے، انگلستان میں حکومت کی ذمہ داری مجلس کی نگرانی میں وزیراعظم پر ہوتی ہے اور امریکہ میں وزیروں کا کوئی سلسلہ نہیں ہے، خود رئیس ایک مجلس کی نگرانی میں حکومت کرتا ہے اور رئیس کے مددگار مختلف شعبوں کے سیکرٹری ہوتے ہیں، اسی جمہوریت کی ایک شکل روس کی جمہوریت اشتراکیہ شورائیت بھی ہے جو مزدوروں اور کسانوں کی مختلف انجمنوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔ اوپر کی سطروں میں حکومت کی تقسیم مختلف ملکوں کی حکومتوں کی تاریخ پر اجمالی نظر ڈال کر کی گئی ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ انسانوں نے اپنے سیاسی امراض کے لیے اب تک علاج کے کون کون سے نسخے اور طریقے استعمال کیے ہیں۔

اسلام کے طرز حکومت پر جب بھی غور کیا گیا ہے تو اس طرح سے کہ جس زمانہ کے ماحول میں اس پر غور کیا گیا ہے۔ اسی کے مطابق اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، سیاسی یورپ نے اسلامی خلافت

کو مذہبی یا اوتاری حکومت کا خطاب دیا، پرانے علماء جو شخصی سلطنتوں کے خورگرم ہیں اس کو شخصی بتاتے ہیں نئے لوگوں نے انگریزوں کے نمونہ کو دیکھ کر اس کو دستوری بتایا، پھر جب جمہوریتوں پر نظر پڑی تو اس کو جمہوریت کہنے میں تامل نہیں کیا، پچھلی جنگ کے بعد جب اشتراکیت نے پاؤں پھیلانے اس کو اشتراکیہ کہنے کی بھی جرات کی گئی، اور اس کے بعد جب موجودہ زعمی حکومت (ڈکٹیٹر شپ) قوت پکڑ رہی ہے اس کو زعمی حکومت ڈکٹیٹر شپ ثابت کرنے کے لیے میلان پیدا ہو رہا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اسلام نے اپنے اولین دور میں علماء جس طرز کی حکومت قائم کی اور جس قسم کی مثالیں، اور تعلیمیں اس نے پیش کیں ان کی روشنی میں اسلامی حکومت کا جو تصور قائم ہوتا ہے اس میں بیک وقت مذہبی، شخصی، دستوری، جمہوری اور زعمی حکومتوں کی خصوصیات اور مظاہر نظر آتے ہیں، اس لیے اہل نظر اپنے اپنے مذاق کے اعتبار سے اس کی تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا طرز حکومت ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ ظہور میں آیا اور اسلام ہی نے اس کو پیش کیا ہے وہ نہ اوتاری ہے، نہ شخصی ہے، نہ دستوری ہے، نہ جمہوری ہے اور نہ زعمی ہے بلکہ ایک ایسا طرز حکومت ہے جس میں ان سب کے خصوصیات و فضائل تو یکجا ہیں، لیکن وہ ان کے قبائح و مشائب سے خالی ہے اس لیے وہ دیکھنے والوں کو کبھی خدائی، کبھی شخصی کبھی زعمی کبھی دستوری اور کبھی جمہوری بلکہ اشتراکی تک نظر آتی ہے لیکن اگر اس کے اصل رخ سے دیکھئے اور اس کے ایک ایک خط و خال کا جائزہ لیجئے تو اس کی شکل سب سے الگ نظر آئے گی۔

اسلام کی سلطنت تمام تر مذہبی احکام پر قائم ہے مگر اس کا امیر یا خلیفہ نہ خدا ہے، نہ خدا کا اوتار ہے، نہ خدا کا منظر ہے، نہ خدا سے ہمکلام ہوتا ہے، نہ خدا سے براہ راست احکام پاتا ہے، نہ اس میں کوئی خدائی تقدیس ہے، نہ وہ خدا کی طرف سے مقرر ہوتا ہے، بلکہ وہ انسان ہوتا ہے جس کو مسلمانوں نے اپنی رائے سے یا سابق امیر نے امت کی سرداری اور خدا کی شریعت کی تنفیذ کے لیے اس کو منتخب کیا ہے تاہم اسلام کی حکومت کو اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان احکام پر مبنی ہے جو رسول کے ذریعہ سے اس کو ملے ہیں، اس کو الٰہی ہی کہا جاسکتا ہے اور اس بناء پر کہ اسلام کی حکومت میں ارباب شوریٰ اور اہل حل و عقد کا گروہ مانا گیا ہے اور شوریٰ اور باہمی مشورہ کی تاکید ہے، اس کو تسامحاً دستوری کہہ دینا ممکن ہے اور اس سبب سے کہ اس کے خلیفہ کا انتخاب افراد امت کے جانب سے بھی ہوتا ہے اور اس کو حکومت کے حقوق اور فوائد میں امت کے تمام افراد سے ایک ذرہ بھی تفوق حاصل نہیں ہوتا، لوگ جمہوری سمجھ سکتے ہیں اور اس خیال سے کہ خلیفہ کے احکام شریعت کی اطاعت امت پر واجب ہے اور وہ امت کے مشوروں کے ماننے پر قطعاً مجبور نہیں، اس کو شخصی کہہ دینا ممکن ہے اور اس نظر سے کہ خلیفہ کے ہر جائز حکم اور صوابدید پر بے چون و چرا عمل کرنا امت کے لیے ضروری ہے اس کو زعمی یعنی ڈکٹیٹر سمجھا جاسکتا ہے، لیکن ان مختلف جہتوں کی بنا پر ظاہر ہے کہ مغربی اہل سیاست کے بنائے ہوئے نظریات حکومت میں سے ایک نظریہ بھی اسلامی طریق حکومت پر پوری طرح صادق نہیں آسکتا۔

اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی نظر حکومت کی ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں چھپیں کر رہ گئی اور اسلام کی نظر اس کے اندر کی حقیقت پر ہے، اس کے نزدیک حکومت کی ظاہر شکل یعنی انتخاب کا طریقہ، ارباب شوریٰ کی ترتیب اور تعین ان کے فرائض و حقوق، ان کے انتخاب، انہماک رائے کے طریقے اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں، اصل چیز حکومت کے امیر و رئیس اور ان کے ارکان و عمال کا تقویٰ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی و ایمانی احساس اور اس حقیقت کی تلقین ہے کہ حکومت کا کوئی جز کسی شخصی یا خاندانی ملکیت نہیں، بلکہ وہ خدا کی ملکیت ہے اور اسی کے حکم یا منشا کے حکم کا نفاذ حکومت کا فرض ہے اور خدا کے بنائے ہوئے اور تعلیم کیے ہوئے احکام و فرائض میں سب مسلمانوں کی حیثیت یکساں ہے اور سب ہی ایک جیسے اس کے بندے اور تابع فرمان ہیں۔

عام سلطنتوں کا اصول یہ ہے کہ وہ سلاطین و حکام اور سلطنت کے عمال کے قول و فعل کو قانون کے سلسلوں سے جکڑ دیتی ہے کہ وہ حق و عدل کے خلاف نہ کر سکیں، لیکن اسلامی حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں اور عاملوں کے دلوں پر اپنا قبضہ بٹھاتی ہے تاکہ تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کے خوف اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کے جذبہ سے حق اور عدل کے خلاف نہ کر سکیں، عام حکومتیں بہر روز اپنے ہر قانون کی لاچاری اور بے اثری کو دیکھ کر دوسرے قانون بناتی ہیں، پھر تیسرا اور چوتھا قانون، پھر سیمپلر ہر قسم کی برائیوں کی روک تھام کے لیے مسلسل قانون بناتی رہتی ہیں اور مجرم اس کو اپنی چالاک اور ہشیاری سے برابر توڑتے رہتے ہیں اور سلطنت کا مقصود حاصل نہیں ہوتا، اس کے برخلاف اسلام کی سلطنت اگر اصول اسلام کے مطابق ہو تو صرف خدا کا تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کا ڈر ان کے دل کی کجی اور عمل کی ہر برائی کو قطعاً ختم کر دیتا ہے جس کی بے شمار مثالیں عہد نبوت، زمانہ خلافت اور بعض نیک و عادل سلاطین کی سلطنتوں میں ملتی ہیں، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ امت میں ایمان اور عمل صالح کی دعوت و تبلیغ برابر جاری رہے اور مسلسل تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت کے ذریعہ اس کو ہمیشہ قائم و باقی رکھا جائے جس طرح آج تمدن اور کلچر کے نام سے یا دوسرے فلسفیانہ یا سیاسی یا اقتصادی نظریات کی بنا پر مختلف ملکوں میں تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت دی جا رہی ہے اور اسی کے معیار پر ہر سلطنت میں تعلیم و تربیت کا جہاں نہ نظام قائم ہے، اسی طرح اس اسلامی نظام حکومت کی برقراری کیلئے بھی سب پہلے اسلامی نظام تعلیم و تربیت کے اجراء کی حاجت ہے۔

✽

اسلامی روایات کی دوسری بنیادی اصل حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے

قال اللہ تعالیٰ: **إِنَّ الْحُكْمَ لِلَّهِ دِيُوسَف ۸۱** حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا۔

آیت بالا میں ارشاد خداوندی ہے کہ حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا ہے، اس لیے اسلام میں حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ لیکن احکام الہی کی دو قسمیں ہیں، ایک تشریعی، یعنی وہ احکام جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے شریعت بن کر نازل ہوتے ہیں اور دوسرے تکوینی، یعنی وہ احکام جو فطری حیثیت سے مخلوقات عالم میں ودیعت رکھے گئے ہیں، ان دونوں قسموں کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی حاکم ہے اور اسی کا حکم جاری ہو رہا ہے، دنیا میں ایسے بادشاہ گذرے ہیں جنہوں نے غرور و فرعون بن کر دعویٰ بادشاہی کیا مگر ان کو بھی تکوینی احکام الہی کے آگے سرنگوں ہو کر جان دینی پڑی، اور یہ شبہ ان سلاطین عالم کو اس لیے پیش آتا ہے کہ وہ اپنے تشریعی احکام و فرائض کے آگے جب خدا کے بندوں کو مطیع پاتے ہیں تو غرور سے تکوینی احکام کا امر بھی اپنے کو جاننے لگتے ہیں، اسلام نے شک و شبہ کے اس رشتہ کو کاٹ ڈالا ہے، اس نے یہ قرار دیا ہے کہ دنیا کے سلاطین نہ تشریعی اختیار رکھتے ہیں اور نہ تکوینی زمین سے آسمان تک ساری بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور امر تکوینی ہو یا تشریعی اس میں اللہ ہی کا فیصلہ فیصلہ ہے، اسی معنی کی قرآن پاک کی کئی آیتیں ہیں،

إِنَّ الْحُكْمَ لِلَّهِ دِيُوسَف ۸۱ حکم نہیں، مگر اللہ کا۔

أُولَٰئِكَ الْحُكْمُ وَهُوَ أَسْرَعُ ہاں! اسی کے لیے حکم کرنا ہے اور حساب کرنے والوں میں سب سے تیز ہے۔

لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (قصص ۷۷) اسی کا حکم کرنا ہے اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

امر تکوینی و فطری میں تو انسان کی ناچاری و مجبوری ظاہر ہے، وہ زمین، آسمان، اور خاک و باد و آب و آتش اور جسم و جان میں ایک ذرہ کی کمی بیشی بھی نہیں کر سکتا، نہ اشیاء کے خواص کو بدل سکتا ہے، نہ ان کی صفات میں تغیر کر سکتا ہے، اور نہ ان کے قواعد و قوانین میں ایک ذرہ کی کمی و اضافہ کر سکتا ہے، خدائی احکام کے آگے سب ہی سرافگندہ اور ناچار ہیں حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں ایک بادشاہ نے جب خدائی کا دعویٰ کیا تو آپ نے اس کو اسی دلیل سے خاموش کر دیا، فرمایا:

فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ تو اللہ سورج کو پورے نکال دے تو تو اس کو پچھم سے

فَأْتِي بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ (نجم ۱۰) نکال، تو وہ کافر لا جواب ہو گیا۔

حکومت و سلطنت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، دنیا میں بھی جو لوگ حاکم کہلاتے ہیں حقیقت میں

اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش سے ہوتے ہیں :

اللَّهُمَّ مَا لَكَ الْمَلِكُ تَوَكَّلْتُ عَلَى الْمَلِكِ مَنْ تَشَاءُ وَآلَ عِمْرَانَ ۝ اے اللہ سلطنت کے مالک تو مجھ کو چاہے سلطنت دے۔
اس لیے راہ صواب پر وہی ہیں جو اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام تلگوینی کی طرح اس کے احکام تشریعی کے بھی تابع سمجھتے ہیں اور جو یہ جانتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے حکومت اسی لیے دی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو دنیا میں اس کی شریعت کے مطابق جاری کریں اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ احکام کے اجراء اور قوانین کے وضع کا اصلی حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، البتہ اس نے اپنی شریعت میں احکام اور قوانین میں جو کلیات اور قواعد بیان فرمادیے ہیں ان کے تتبع سے اہل علم اور مجتہدین دین نئے نئے احکام جزئیہ مستنبط کر سکتے ہیں۔

ان احکام الہی کی نسبت اس حیثیت سے کہ ان میں عقلی مصلحتیں ہوں اور طبعی نفع و ضرر پر مشتمل ہوں، بے شبہ اہل عقل اپنی عقل و فہم سے فیصلہ کر سکتے ہیں، لیکن شریعت میں احکام کا مدار صرف اسی حیثیت پر نہیں ہے، بلکہ اس سے اہم حیثیت یہ ہے کہ ان میں سے کسی بات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا یا عدم رضا شامل ہے، یا یوں کہیے کہ کس فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب یا عقاب ترتیب ہوتا ہے، اس کا حال صرف اللہ تعالیٰ کے ارشاد اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیان ہی سے معلوم ہو سکتا ہے، اہل عقل اپنی ناقص عقل سے جو کچھ کہتے ہیں اگر وہ حکم الہی کے مطابق نہیں ہے تو گو اس میں کچھ ظاہر مصلحتیں ہوں مگر حقیقی مصلحتوں کے جاننے کے لیے امر غائب اور مستقبل کا صحیح علم ہونا ضروری ہے، اور یہ انسان کے بس سے باہر کی بات ہے اس لیے حقیقی مصلحتیں اسی حکم میں ہیں جس کو خدا نے عالم الغیب نے نازل فرمایا :

ان تمام مذکورہ بالا امور کے لحاظ سے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ قانون کا حاکم اور امر و نہی کا وضع صرف اللہ تعالیٰ ہے، قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں ادا کیا گیا ہے، عام طور سے فقہاء نے اس پر ان دو آیتوں سے استدلال کیا ہے :

۱- اِنْ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (انعام و یوسف : ۸) حکم صرف اللہ کے لیے ہے۔

۲- اِلَّا لَهُ الْخُلُقُ وَالْاُمُورُ (اعراف : ۷) ہاں اسی اللہ کے لیے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا۔

یہ دونوں آیتیں جن موقعوں پر وارد ہیں ان سے موہم ہوتا ہے کہ یہ حکم اور امر تلگوینیات اور حوادث عالم سے متعلق ہے، پہلی آیت دو جگہ ہے، سورہ انعام اور سورہ یوسف میں، سورہ انعام کا موقع یہ ہے کہ کفار نبی کی صداقت کے ثبوت میں عذاب کا جلد مشاہدہ چاہتے تھے، اس کے جواب میں ہے :

مَا عِنْدِي مِمَّا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ اِنْ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ يَقْضُ الْحَقُّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِينَ (انعام : ۷۷) جس چیز کا تم تقاضا کر رہے ہو، وہ میرے پاس نہیں، حکم کسی کا نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے، اللہ تعالیٰ واقعی بات بتلا دیتا ہے اور وہی سب سے اچھا فیصلہ کر دیتا ہے۔

دوسری جگہ سورہ یوسف میں اس موقع پر ہے جب وہ اپنے بیٹوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ مہر میں مختلف دروازوں سے داخل ہونا کہ کسی آفت میں نہ پھنسوں، پھر فرماتے ہیں کہ یہ تو انسانی تدبیر ہے مگر ہوگا وہی جو اللہ کو منظور ہے۔

وَمَا اُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ اِنْ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ (یوسف : ۸۰) اور خدا کے حکم کو میں تم سے نال نہیں سکتا، حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے (یاد رہے اس سیر ظاہر کے دل سے اس پر بھر دوسرے کھتا ہوا وہی پروردگار دوسرے رکھنے والوں کو بھر دوسرے رکھنا چاہیے۔)

دوسری آیت کا موقع یہ ہے :

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْكَرْسِ يُغْشِي اللَّيْلُ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَنَیْنًا وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرٰتٍ بَاَمْرِهِ اِلٰهِ الْخَلْقِ وَالْاُمُورِ تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ (اعراف : ۵۴) بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب سامان اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا، پھر عرش پر قائم ہوا، چھپا دیتا ہے شب دن کو ایسے طور پر کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے لے آتی ہے، اور سورج اور چاند اور دوسرے سیاروں کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب اس کے حکم کے تابع ہیں، یاد رکھو اللہ ہی کیلئے خاص خالق ہونا اور حاکم ہونا بڑی خوبیوں کے ساتھ بھر ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے پروردگار ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ اس امر کا تعلق خلق و تکوین سے ہے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ لفظ اُمُور اور حُکْم کی لغوی وسعت کی بنا پر امور شرعی کو بھی کسی درجہ میں شامل ہو جائیں، لیکن قرآن پاک اور احادیث میں جب دوسرے تصریحی دلائل اس دعویٰ پر موجود ہیں تو اس تصریح کو چھوڑ کر اجالی دلیل پر تنازع کیوں کی جائے۔ عبادت کے معنی صرف کسی کو معبود بنا کر پکارنے ہی کے نہیں ہیں، بلکہ اگر کسی کو زبان سے معبود بھی کہا جائے اور اس کی ظاہری پرستش نہ بھی کی جائے لیکن اس کے احکام کی مثل خدا کے حکم کی مستقلاً اطاعت کی جائے تو یہ بھی عبادت ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ادا ہوتا ہے :

لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ (مریم : ۵) شیطان کی عبادت نہ کر۔

دوسری جگہ ارشاد الہی ہے :

اَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ (یسین : ۳) یہ کہ شیطان کی عبادت نہ کرو۔

ادھر کی آیتوں سے واضح ہوا کہ اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، یہاں سوال پیدا ہوتا ہے تو پھر اسلام میں انبیاء اور آئمہ زمانہ اور خلفاء کی اطاعت کا حکم کیونکر صحیح ہو سکتا ہے، جواب یہ ہے کہ بے شبہ اسلام میں اطاعت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، لیکن دوسروں کی اطاعت احکام الہی کی تبلیغ اجراء اور تنفیذ کے لیے حکم الہی کے تحت ہے، ارشاد الہی ہے :

اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاطِيعُوا الرَّسُوْلَ وَاُوْلٰی اِلَیْهِ مِنْكُمْ (انعام : ۷۷) اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔

اولوالامر کی اطاعت، خواہ اس سے مراد علماء ہوں یا حکام، خدا کے حکم کے تحت اسی کے احکام کی تنفیذ اور اجراء میں ہے، اور رسول کی اطاعت بھی احکام الہی کی تنفیذ ہی کی خاطر جیسا کہ ارشاد ہے:

وَمَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (نساء: ۸۰) اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اس سے پہلے اسی سورہ میں ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطِيعَ (نساء: ۷۷) اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا، لیکن اس لیے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

یہود اور نصاریٰ نے احکام الہی کو چھوڑ کر اپنے راہبوں اور کاہنوں اور پوپوں کی اطاعت کو دین بنا رکھا تھا اور ان کا حکم حکم خدا سے مانع و مستبعد بلکہ مستقل حکم کے طور پر بجالایا جاتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کو مشرک کا ملزم قرار دیا ہے اور ان سے جزیہ لینے یا قتال کر نیک حکم دیا گیا ہے، ارشاد ہے:

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ
الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ
وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ
مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ (توبہ: ۲۴)

ان آیات میں اہل کتاب پر اللہ پر ایمان نہ رکھنے کا جو الزام قائم کیا گیا ہے وہ اسی لحاظ سے ہے کہ وہ صرف حکم الہی کے پابند نہیں ہیں، بلکہ یہ مرتبدانہوں نے خدا کے بندوں کو بھی دے رکھا ہے چنانچہ اس کے بعد اس کی تفسیر ہے:

اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهَبَانَهُمْ أَرْبَابًا
مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ
وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ إِلَهًا
وَاحِدًا (توبہ: ۳۰)

عالموں اور راہبوں کو رب بنانا اسی بنا پر ہے کہ وہ ان کے حکموں کو بھی مستقلاً خدا کا حکم تسلیم کرتے تھے کیونکہ ان عالموں اور راہبوں کو یہ دعویٰ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو غیبی طور پر اپنے حکموں اور معاملات کے فیصلوں مطلع فرماتا ہے، اسلام نے اہل کتاب کو دوسری سورہ میں اسی مشرک سے باز رہنے کی دعوت دی۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ
بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا
نَشْرِكُ بِهِ شَيْئًا وَلَّا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا
أَرْبَابًا مِمَّنْ دُونِ اللَّهِ (آل عمران: ۶۴)

ہم ایک خدا کو چھوڑ کر دوسرے کو رب بنائیں۔

یہ رب بنانا اطاعت ہی کی بنا پر ہے، ترمذی اور مسند احمد میں ہے کہ جب حدی بن حاتم جو ایک عیسائی عرب امیر تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ نے ان کے سامنے سجدہ توبہ والی آیت مذکورہ پڑھی تو حدی نے کہا: "وہ ان کو معبود نہیں ہوتے، مگر بایا کیوں نہیں، انہوں نے ان کے لیے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا اور انہوں نے ان کے احکام کو مانا، یہی ان کا ان کو معبود بنانا ہے، الفاظ میں فذلک عبادتکم ما قبلہم ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ان وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے، لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال کہتے تھے تو یہ حلال مان لیتے تھے اور جب حرام کہتے تھے تو یہ حرام سمجھ لیتے تھے، یہی تو شرک ہے بلکہ

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی شے کو حلال یا حرام ٹھہرانا کسی انسان کا کام نہیں، بلکہ خدا کا ہے، اور اسی کا نام وضع حکم ہے، اس تحلیل و تحریم میں کسی کو خریک ٹھہرانا مشرک ہے، اسی طرح خدا کے علاوہ یا خدا کے حکم کیساتھ باواسطہ حکم خداوندی کسی دوسرے کے حکم کی اطاعت بھی مشرک ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان عرب اور یہود منافقین کو جو قانون الہی کی حکمت سے بچنے کے لیے یا ایمان کی کمزوری کے سبب سے اپنے مقتات یہودیوں کی عادات میں لیجاتے تھے، یا ان کے فیصلہ کے لیے عرب کاہنوں کے پاس جلتے تھے زجر و توبیخ فرمائی اور ان کے اس فعل کو کھانا نفاق اور شرک فرمایا چنانچہ بعض اصولی احکام عدل انصاف اور طریق اطاعت احکام کے ذکر کے بعد ارشاد ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا
بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ
يُرِيدُونَ أَنْ يُشْحَبُوا إِلَى الْأَعْرَابِ وَقَدْ
أُفْرِقُوا أَنْ يُكْفَرُوا بِهِ (نساء: ۹۱)

کیا تو نے انہوں کو نہیں دیکھا جو گمان کرتے ہیں کہ وہ اس جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا ایمان لے چکے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ طاعت کو اپنا حاکم بنائیں، حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں۔ طاعت لغت میں ہر اس شے کو کہتے ہیں جس کو خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر معبود بنایا جائے، کل معبود من دون اللہ "اور اہل تفسیر نے شان نزول کا لحاظ کر کے کہی اس سے کاہنوں، جادو گروں اور کسی یہودی جاکوں کو مراد لیا ہے، اس لیے اس کا مشترک مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جس کے احکام کو تو لوگ کا درجہ دیکر اطاعت کی جلتے اور اس کے مطابق فیصلہ چاہ جاتے، وہ طاعت ہے قرآن مجید میں یہ لغت سے لگھوں پر آیا ہے اور ہر جگہ اس سے مراد حاکم باطل اور معبود باطل لیا گیا ہے۔ قرآن میں الہی کو چھوڑ کر کسی اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا اور فیصلہ چاہنا فسق ہے اور اس کا مترادف فاسق کہلائے گا۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْفَاسِقُونَ (مائدہ: ۷۷)

اور اللہ نے جو احکام اس کے روئے جو فیصلہ نہیں کرتے وہی فاسق ہیں۔

لے تفسیر ابن کثیر سے ترمذی تفسیر آیت توبہ ۶۴

اللہ تعالیٰ نے ان احکام کا دوسرا نام حدود و ارشاد فرمایا ہے، حدود وہ نشانات ہیں جہاں تک آگے بڑھنے کی انسان کو اجازت ہے اور جس سے تل بھر آگے بڑھنے کی جرات گناہ اور عصیان ہے، اور یہ حدود اللہ تعالیٰ ہی کے بنائے ہوئے ہیں، اور ان کا نزول اللہ تعالیٰ ہی کے یہاں سے ہوا ہے قرآن پاک میں سورہ بقرہ اور نساء اور طلاق میں احکام الہی کے بیان کے بعد ارشاد ہے:

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَمَنْ يُتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ دُطْلَاقِ ۱۰

یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں۔
یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں جو ان حدوں سے آگے بڑھے گا، وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔

سورہ نساء میں وصیت کے قواعد کی تفصیل بتا کر آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ يَدْخُلْهُ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُهِينٌ (نساء: ۲۰)

اس کو وہ دوزخ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے بڑی ذلت کی سزا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان حدود پر عمل اللہ تعالیٰ و رسول کی اطاعت اور اس کی جزاء جنت کی نعمت ہے اور ان سے انحراف اللہ اور رسول کی نافرمانی اور اس کا نتیجہ دوزخ کی سزا اور ذلت کی تباہی ہے اور رسول کی اطاعت و حقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

قانون و شرع کی حقیقت تحلیل و تحریم ہی ہے اور یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے انسان اگر اپنی طرف سے کسی قانون کو وضع کر لے اور بلا سند الہی کسی شے کو حلال یا حرام کر لے تو اس کا نام "افتراء علی اللہ" خدا پر جھوٹ تہمت باندھنا ہے، ارشاد ہوا:

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ لِنُفُورِنا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبُ ۚ لَا يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَافِرِينَ (نساء: ۵۵)

اور جن چیزوں کو تم اپنی زبان سے (حلال و حرام) بتاتے ہو، ان کی نسبت یہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، تاکہ تم اللہ پر جھوٹ تہمت لگاؤ، یہ (دنیا میں) چند روز فائدہ ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اس آیت پاک میں نہ صرف یہ کہ اس حلال و حرام کی شریعت کو اپنے لیے مخصوص فرمایا بلکہ یہ بھی پیشینگوئی فرمادی کہ جو لوگ شریعت الہی کو چھوڑ کر خود اپنی شریعت بنائیں گے، گو ان کو تھوڑے دن کا فائدہ حاصل ہو جائے مگر وہ ان کے لیے عذاب ہی ثابت ہوگا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو شریعت الہی کے منظر تھے اور بندوں کو احکام الہی سے آگاہ فرماتے

تھے، اور اس حیثیت سے آپ کا ہر حکم حکم الہی ہے، لیکن حکم الہی کے بغیر ایک مرتبہ آپ نے ایک چیز کو اپنے لیے حرام قرار دیا تو عتاب الہی آیا
يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ دُخْرِي ۚ

اے پیغمبر! تو کیوں اس کو حرام کرتا ہے جس کو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا۔
اس سے معلوم ہوا کہ یہ استحقاق نبی کو بھی حاصل نہیں، حالانکہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی مباح چیز کا استعمال اپنی کسی ذاتی مصلحت کی بنا پر ترک کر دے مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس حق کے استعمال سے آپ کو منع فرمادیا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس سے دو نقصان تھے ایک یہ کہ نبی کا ہر فعل جو اس کے لیے مخصوص نہ ہو امت کے لیے حکم الہی کے تحت شرع کا حکم رہتا ہے، اس قاعدہ کی بنا پر آپ کے اس ترک سے امت اپنے لیے بھی ایک حلال چیز کو حرام سمجھ لیتی، دوسرے یہ ثابت ہوتا کہ نبی کو بغیر اذن الہی کے بھی حق تشریع ہے، جو صحیح نہ ہوتا، اسی لیے نبی کی تشریعی حیثیت یہی ہے کہ وہ شریعت الہی کا مبلغ اور قانون ربانی کا شارح اور منظر ہے، قرآن پاک کی اس آیت میں ہے:

وَلَا يَحْزَنُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ۚ

اور در یہود و نصاریٰ اے حرام نہیں کرتے جس کو اللہ (توبہ: ۳۱) اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے۔

اس آیت میں رسول کی طرف جو تحریم کی نسبت ہے وہ اسی حیثیت سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مبلغ تھے، رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے، جس طرح احکام میں اولوالامر کی اطاعت عین رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے، جس طرح احکام میں اولوالامر کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے کیونکہ وہ رسول ہی کے لائے ہوئے احکام کو پیش کرتے ہیں۔

اسلام میں علوم کی تدوین کے زمانہ میں یہ مسئلہ کہ حاکم شرع اللہ تعالیٰ ہے، اصول کا مسئلہ بن گیا ہے، چنانچہ علم عقائد اور اصول فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ پر بحثیں موجود ہیں۔
علم اصول فقہ میں یہ مسئلہ اس حیثیت سے زیر بحث آیا ہے کہ واضح قانون صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اسی کے امر و نہی سے بندوں نے فرض و واجب اور حرام و حلال کو جانا۔

علامہ آمدی المتوفی ۱۲۱۵ھ اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں:

اعلم انه لا حاكم سوى الله تعالى ولا حكم الا ما حكم به، ويتفرع عليه ان العقل لا يحسن ولا يقبح ولا يوجب شكرا لمنعه وان لا حكم قبل ورود الشرع (۱، ۱۱۳ مصر)

مقصود یہ ہے کہ احکام شریعت اور قانون شرعی کا واضح صرف اللہ تعالیٰ ہے، اسی کا حکم حکم ہے

اور اسی کا قانون قانون ہے اس بنا پر شرع کے نزول سے پہلے تنہا عقل کے رو سے کوئی حکم فرض واجب، سنت، مستحب یا حرام، ناجائز و مکروہ کی صورت میں جس کے قائل پر ثواب یا عقاب کا حکم عائد کیا جاسکے، نہیں ہو سکتا اور نہ عقل اپنی تنہا کوشش سے کسی بات کو بہ اعتبار ثواب یا عذاب کے اچھایا بُرا کر سکتی ہے، علامہ ابن ہمام حنفی المتوفی ۷۵۰ھ تحریر میں لکھتے ہیں:

الحاکم لا خلاف فی انه رقب العلمین (ص ۲۰۸۹) اس میں اختلاف نہیں کہ حکم کا واضح پروردگار عالم ہے۔ قاضی بیضاوی المتوفی ۷۵۰ھ کی مسہاج الاصول کی شرح میں علامہ سنویٰ اصرار کرتے ہیں۔ حسن وقع اور شے کے اچھے یا بُرے ہونے کے ایک معنی یہ ہیں کہ اس شے کو فطرت پسند کرتی ہے یا اسے نفرت رکھتی ہے جیسے دُوبتوں کو پانی سے باہر نکالنا اچھی بات ہے، اور کسی کا مال ظلم سے لے لینا بُرا ہے اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ایک کمال کی صفت ہے اور دوسری نفس کی جیسے علم چاہے اور جبل بُرا ہے، ان دونوں معنوں کے لحاظ سے ان کے اچھے یا بُرے ہونے کا عقل کی رو سے فیصلہ کرنے میں اختلاف نہیں ہے، اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل پر ثواب اور کسی پر عذاب کے ترتیب کا فیصلہ صرف شریعت سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اشاعرہ (اور عام اہلسنت) کے نزدیک حسن وقوع کے یہ دونوں فیصلے شرع پر موقوف نہیں، اور معتزلہ کہتے ہیں کہ عقل اس کا فیصلہ کر سکتی ہے اور اس فیصلہ کے لیے حکم الہی کے درود کا انتظار نہیں کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ پر بندوں کے مصالح اور مفاسد کی مراعات (لحاظ کرنا) واجب ہے، شریعت کے نزول سے عقل کا فیصلہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے۔ (ص ۹۰ جزئیہ تحریر ابن ہمام) معتزلہ نے حقیقت میں الٰہی بات کہی ہے، یہ کہ شریعت کے فیصلہ سے حکم کی معرفت ہوتی ہے، اور عقل سے اس کی مصلحت، قیاس و تجربہ کی بنا پر اہل عقل کے نزدیک مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے اور یہی اہل سنت میں سے متاخرین مابعدیہ (حنفیہ) کا مسلک حق ہے، مولانا محب اللہ بہاری المتوفی ۱۳۵۰ھ مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں:

حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کمال و نقص اور دنیاوی و غرض و مصلحت موافق یا مخالف ہونیکا فیصلہ عقل سے ہونا ہے اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل کے کرنیوالے کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مدح یا مذمت کا مستحق ہونا عقل کے بعد سے سمجھا جاسکتا ہے یا صرف شرع سے؟ تو اشاعرہ کے نزدیک وہ صرف شرع سے معلوم ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اچھا فرمایا وہ اچھا ہے اور جس کو بُرا فرمایا وہ بُرا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ اس کی خلاف فرمائا تو وہی اچھا یا بُرا ہوتا اور ہمارے لیے مابعدیہ، اور معتزلہ کے نزدیک وہ عقل سے معلوم ہو سکتا ہے، لیکن مابعدیہ اور معتزلہ میں فرق یہ ہے کہ معتزلہ اور مابعدیہ اور کرامیہ وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے اسی کے مطابق حکم دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے اور ہمارے نزدیک یہ ہے کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے، وہ پہلو اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ حکم دے اور انا حکم سے ہیں جب تک اللہ تعالیٰ حکم دے کوئی حکم محض عقل سے نہیں نکلتا (للقالۃ الثانیۃ فی الاحکام) بعض اہل اصول نے معتزلہ کی طرف جو یہ نسبت کی ہے کہ وہ حاکم قانون عقل کو سمجھتے ہیں، مولانا بھگت علی نے شرع مسلم الثبوت میں اسی مسئلہ کی شرح میں اس کی تردید کی ہے، فرماتے ہیں:

اس مسئلہ پر حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، تمام امت کا اجماع ہے اور ہر مشائخ کی بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہے کہ یہ ہمارے نزدیک ہے اور معتزلہ کے نزدیک واضح قانون و حاکم عقل ہے، یہ غلط ہے کیونکہ ایسا کہنے کی جرأت کسی ایسے شخص کو نہیں ہو سکتی جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو، بلکہ معتزلہ یہ کہتے ہیں عقل بعض احکام اللہ کو جان سکتی ہے چاہے شرع اس میں وارد ہو یا نہ ہو اور یہی ہمارے اکابر مشائخ کے نزدیک بھی ثابت ہے۔

قاضی شوکانی المتوفی ۱۲۳۵ھ کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے اختلاف اور اتفاق کے موقع میں حسب ذیل فرق ہے۔

اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ نبی کی بعثت اور اس کی دعوت کے پہنچنے کے بعد حاکم قانون صرف شرع ہے، اختلاف اس زمانہ اور حالت سے متعلق ہے جب نبی کی بعثت نہ ہو، یا اس کی دعوت کسی تک نہ پہنچی ہو تو اشاعرہ کے نزدیک اس وقت کسی حکم کا کوئی مکلف نہیں ہے، نہ کفر حرام ہے، نہ ایمان واجب ہے اور معتزلہ کے نزدیک اس وقت بھی عقل کے رو سے جو حکم ہو اس کے ساتھ حکم الہی کا تعلق سمجھا جائے گا (ص ۱۶، ارشاد الغول، مصر)

اب آخر میں ہم حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ کا وہ قول فیصلہ نقل کرتے ہیں جو ان تمام مباحث کا بخوبی در خلاصہ ہے:

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم نہیں، اسی کے لیے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا اور عقل وغیرہ کسی مخلوق کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی حکم کو ثابت کرے، اللہ تعالیٰ نے وجوب یا استحباب کے ساتھ جس کا حکم دیا وہ درحقیقت حسن (اچھا) ہے عام اس سے کہ وہ لذائذ حسن ہے یا اپنے کسی صفت یا اپنے کسی متعلق کی بنا پر، اسی طرح جس سے منع فرمایا وہ قبیح (بُرا) ہے تو افعال کا حسن و قبح کے ساتھ انصاف، امر و نہی سے پہلے ہی عالم حقیقت میں ہو چکا تھا اسی کی رعایت کر کے اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے، عقل کبھی ان کے حسن و قبح کو معلوم کر لیتی ہے، تو اس موقع پر اس حسن و قبح کو عقل کہہ دیتی ہے، لیکن شرع کے درود پہلے کوئی حکم تھا تو یہ مذکورہ بالا حسن و قبح بندہ کے حق میں صرف شرع الہی پر مبنی ہیں (ص ۱۳) حضرت مولانا شہید کا یہ رسالہ اصول فقہ و درحقیقت اصول فقہ کی تہذیب ہے، اس میں فن کے بڑے بڑے مسئلوں کو ایک ایک دُرود و فقرہ میں طے فرما دیا ہے، اور ہر کی عبارت میں مصنف نے جو کچھ کہا ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ قانون کا واضح درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے، یہ حق مخلوقات میں سے کسی کے لیے ثابت نہیں ہے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے وہ تمام تر حکمت اور بندوں کی مصلحت پر مبنی ہے عقل کبھی اس حکمت و مصلحت کو پالیتی ہے تو اس کو عقل بھی کہہ سکتے ہیں، ورنہ عقلی کہنے کا یہ منشاء نہیں کہ عقل اس قانون کی واضح اور آ مر ہے۔

اس تفصیل کی ضرورت اس لیے پیش آئی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے ماہرین قانون نے شرع سے انحراف اس اصول کو مان لیا ہے کہ اسلام میں وضع قانون کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، وہی ایک حاکم، آمر اور واضح شرع ہے۔

اس موقع پر بعض صاحبوں کو یہ شبہ پیش آئے گا کہ یہ قانون شرع تو کسی قدم زمانہ میں ایک وقت

لہ تہذیب منطق میں ایک مختصر متن تین کا نام ہے جس میں بڑے بڑے فیصلوں کو جن پر مباحث کے ذریعہ ایک فقرہ لکھا گیا ہے

خاص میں نازل ہوا، وہ زمانہ کی ہر ضرورت اور نئے حالات کے مناسب قیامت تک کے لیے کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہی قانون کے اصول، اور کلیات اور دو سر ہیں اس کے فروع اور جزئیات، دینکے ہر قانون کے اصول و کلیات خواہ وہ عقلی اور تجربی ہوں، ہمیشہ یکساں رہتے ہیں، ان میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا، تغیر و تبدل اور تبدل یعنی نئی نئی صورتوں کا پیش آنا، یہ واقعات اور حوادث میں ہوتا ہے، جو انہی کلیات کے اندر مندرج ہوتے ہیں، جیسے فن طب جب بھی بنا ہو لیکن اس کے اصول و کلیات پرانے اور غیر مبدل ہیں، اب جو بھی بیماریاں ظاہر ہوں، قدیم اصول کے تحت ان کا بیان طب کی کتابوں میں موجود ہے، مثال کے لیے یوں سمجھئے کہ قتل ناحق کی سزا قصاص، دیت اور کفارہ وغیرہ شرع میں مقرر ہے، اب یہ بات کہ قتل پہلے تیر اور تلوار سے ہوتا تھا اور اب ہندوق سے، پیچھے سے، ریلوے سے، توپ سے، گولہ سے اور مختلف نئے اوزاروں سے ہوتا ہے لیکن ذرائع قتل کا تغیر نفس مسئلہ کی صورت میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتا، کسی کی سواری سے کسی کو نقصان پہنچ جانے تو اس کا اصولی جواب شرح میں موجود ہے، پہلے یہ سواری جانوروں کی صورت میں محدود تھی، اور اب طرح طرح کی گاڑیوں، سائیکلوں، سکوتروں، موٹروں، ریلوں وغیرہ کی صورت میں ہے، ان سے حادثے پیش آجائیں، یا نقصان پہنچ جائے تو اصول کلیہ میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

دوسرا شبہ یہ پیش آسکتا ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے تو ہر زمانہ کے مجتہد نئے نئے حالات کے پیش نظر اپنے اجتہاد سے جو حکم دیتے ہیں، کیا وہ نیا حکم نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ مجتہد وہ ہیں جو احکام کے اصول و فروع پر پوری نظر رکھتے ہوں، آیات و احادیث سے احکام کے اصول کلی اور ان کے علل و اسباب اور مصالح و مقاصد کو جانتے ہوں اور ان کے مطابق نئی پیش آنی والی جزئی صورتوں کا فیصلہ کرتے ہوں، اس بنا پر ان کا اجتہاد اور قیاس کسی نئے حکم کا واضح اور مخترع نہیں، بلکہ منظر ہے، یعنی وہ حکم کا اختراع نہیں کرتے بلکہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مقررہ احکام الہی کے تحت اس نئی صورت کا یہ جواب ہے، اہل اصول کے اس مسئلے کے قیاس حکم کا صرف منظر ہے، یہی معنی ہیں کہ وہ بتاتا ہے کہ یہ نیا جزئیہ فلاں اصول کلی کے ماتحت ہے انہی اصولوں کی بنا پر ہمارے فقہانے فتاویٰ کا پورا دفتر مرتب کیا ہے، جس کے مطابق ہر زمانہ میں ہر ضرورت کا جواب دیا جاسکتا ہے اور جس پر دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی عظیم الشان حکومتیں اور عدالتیں قائم ہوئیں اور اب بھی قائم ہیں۔

الحمد لله جلد ہفتم ختم شد

APPROVED

By WWW.ATTABLIG.COM at 3:29 pm, Oct 19, 2010